جاسوسی دنیا
16
خونی پتھر
ابنِ صفی
اسرار پبلیکیشنز لاہور

خونی پتھر

جاسوسی دنیا سیریز نمبر ۱۶

ابنِ صفی

۱۹۵۳

نوشتہ

انٹرنیٹ ایڈیشن ۲۰۲۵

پیش رس

انور سیریز کا چوتھا ناول پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس سیریز کا چوتھا اور آخری معمولی شمارہ ہے۔ پانچواں ناول اس سیریز کا خاص نمبر ہو گا جس میں انور اور رشیدہ کے ساتھ انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید بھی ہوں گے۔ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ انور اور رشیدہ کے بارہ ناول پیش کروں گا لیکن اتّفاق سے میرے پڑھنے والوں میں دو گروہ ہو گئے ایک کا مطالبہ ہے کہ "فریدی اور حمید" سیریز پھر سے شروع کیا جائے اور دوسرا انور سیریز کو بھی پسند کر رہا ہے۔

بہر حال تعداد انہی لوگوں کی زیادہ ہے جو "جاسوسی دُنیا" میں صرف فریدی اور

حمید کے کارنامے دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ شمارے (خاص نمبر) سے پھر فریدی اور حمید کے کارنامے شروع کر دوں۔

پیش ناول "خونی پتھّر" میں ایک حیرت انگیز داستان ہے جو ایک سیاہ رنگ کے بیش قیمت پتھّر کی چوری سے شروع ہوتی ہے اور ایک بھیانک موڑ پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جوان سال پرائیویٹ جاسوس انور ناول کے شروع میں ہی ایک بھیانک جال میں پھنس جاتا ہے۔ کیا وہ در حقیقت جال تھا؟ پروفیسر تیموری کو کس نے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک قتل اور کیا رابعہ قاتل تھی؟ پروفیسر تیموری کے سیکریٹری کو بھی آپ قاتل سمجھیں گے، گلوریا بھی آپ کو قاتل ہی معلوم ہو گی اور سر صغیر احمد تو سو فیصدی قاتل تھا۔ اس ناول کا ہر کردار آپ کو قاتل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً قاتل کون تھا؟ یہ معلوم کر کے آپ انگشت بہ دنداں رہ جائیں گے اور قتل کا مقصد؟ وہ بھی قاتل ہی کی طرح حیرت انگیز ثابت ہو گا۔

ابن صفی

پتھّر کی واپسی

انور ایک گھٹیا سے ہوٹل میں بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر اُسے مدعو کرنے والی نے اس نامعقول ہوٹل کو کیوں منتخب کیا۔ اسے درمیانے درجے کا ہوٹل بھی کہا جا سکتا تھا۔ ویسے اس کے مالک نے کوشش تو یہی کی تھی کہ اُسے درمیانے یا اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں کی نقل بنا دے اور شاید ایسا ہو بھی سکتا تھا مگر ملازمین یا منتظم کی پیدائشی لاپروائی اور بد سلیقگی نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہاں متعدد کیبن ضرور تھے لیکن ان کے پردے یا تو بوسیدہ تھے یا گندے۔ تھری پلائی وُڈ کے پارٹیشنوں پر جگہ

جگہ ہندسے لکھ کر جوڑے گئے تھے۔ کہیں کہیں پان کھانے والوں کی کتھّے اور چونے بھری انگلیوں کے نشانات بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر برسوں پرانی تصویریں تھیں۔ جن پر نہ جانے کب سے گرد کی تہیں جمتی چلی آ رہی تھیں۔ ان تصویروں کے درمیان کُچھ طغرے بھی تھے جہاں کہیں ان سے جگہ بچ گئی تھی وہاں گاہکوں کے لیے ضروری ہدایات لکھ کر چپکا دی گئی تھیں۔ کُچھ تحریریں قطعی غیر متعلّق تھیں جنھیں انور بالترتیب پڑھ پڑھ کر الجھ رہا تھا۔ اُن کی ترتیب کُچھ اس قسم کی تھی۔

”براہِ مہربانی فرش پر مت تھوکیے۔“

”واپس ملی ہوئی رقم کی اچھّی طرح جانچ کر لیجیے۔“

”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”ملازمین سے جھگڑا کرنے کے بجائے اپنی شکایات کا اظہار منیجر سے کیجیے۔“

”شہنشاہِ ایران زندہ باد۔“

”غُسل خانہ اندر ہے۔“

”نصر من اللہ فتح قریب“

”سو روپے کے نوٹ کی ریز گاری نہیں ملے گی۔“

”طلب کی ہوئی اشیاء واپس نہیں لی جاتیں۔“

”اسلام زندہ باد۔“

”سیاسی گفتگو سے پرہیز کیجیے۔“

”قیامت ضرور آئے گی۔ اللہ کا وعدہ سچّا ہے۔“

”نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیئے۔“

”پیٹ کے امراض کا واحد علاج چورن انار دانہ۔“

انور ان سب کو تیرہ چودہ بار دہرا چکا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ قبل وہ یہاں پہنچا تھا اور اب انتظار کی معیّنہ مُدّت میں صرف دس منٹ اور باقی رہ گئے تھے۔ وہ یہاں

کُچھ عجیب و غریب حالات کے تحت آیا تھا۔ آج آفس میں اُسے کسی گمنام عورت کا خط ملا تھا جس میں اس نے اس سے استدعا کی تھی کہ وہ مذکورہ ہوٹل میں ایک بج کر پچیس منٹ تک اس کا انتظار کرے۔ اسے کسی بہت ہی اہم معاملے میں انور کی مدد درکار تھی۔ اس نے خط میں اس کیبن کا نمبر بھی لکھ دیا تھا جس میں ان دونوں کا ملنا تھا۔

انور کے لیے یہ پہلا اتّفاق تھا کہ اُسے ایسے ہوٹل میں کسی نے مدعو کیا تھا۔ اُس سے عموماً وہی لوگ مدد لیا کرتے تھے جو کسی وجہ سے محکمہ پولیس سے رابطہ قائم کرنے میں ہچکچاتے تھے اور ایسے لوگ ابھی تک سو فیصدی دولت مند ہی ثابت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ کسی پرائیویٹ جاسوس کے اخراجات کا بار عام آدمی نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا انور کے لیے یہ چیز خاصی اُلجھن کا باعث بن گئی تھی کہ اگر وہ دولت مند ہے اور کسی اونچی سوسائٹی سے تعلّق رکھتی ہے تو اُس نے ایسے ہوٹل کا انتخاب کیسے کیا۔

اُس کی نظریں پھر دیوار سے لگے ہوئے کلاک کی طرف اٹھیں۔ پانچ منٹ اور

باقی رہ گئے تھے۔ بیس منٹ اُس نے کسی نہ کسی طرح گذار دیئے تھے۔ لیکن یہ پانچ منٹ اس کے خیال کے مطابق وبالِ جان بننے والے تھے۔ اس دوران میں ہوٹل کے کئی گندے لڑکے اس کے آرڈر کے لیے کیبن کا چکّر لگا چکے تھے حالانکہ انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں سے ایک نہ ایک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کیبن کے سامنے آ کھڑا ہو جاتا تھا۔

شاید اس رویّے کی محرک معقول قسم کی ٹِپ کی توقّع تھی۔ آخر وہ پانچ منٹ بھی گذر گئے۔ انور جھنجھلا کر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت کیبن کے سامنے آ کر رُکی۔ اس نے ایک معمولی سی سفید ساری باندھ رکھی تھی۔ پیر میں سیاہ پیٹنٹ کے پرانے سینڈل تھے جن کا وارنش کہنگی کی وجہ سے جگہ جگہ سے چٹخا ہوا تھا۔ عمر بمشکل انیس بیس کی رہی ہو گی۔ جسم صحت مند اور شخصیت جاذب توجّہ تھی۔

حسین بھی تھی لیکن اتنی نہیں کہ اس پر شعر کہے جا سکیں۔ آنکھوں میں

ہچکچاہٹ یا شرمیلے پن کے بجائے ایک عجیب قسم کی بے تعلّقی تھی۔ وہ ایک لمحہ تک انور کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہی پھر مُسکرا کر آگے بڑھی۔

"مسٹر انور۔۔۔!" اس نے کیبن میں داخل ہو کر آہستہ سے کہا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے۔" انور اٹھنے کی بجائے کُرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

"کیا مجھے دیر ہو گئی۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے۔" انور سنجیدگی سے بولا۔ "آپ دو منٹ دیر سے پہنچیں۔"

"مُجھے افسوس ہے کے آپ دوپہر کا کھانا کھا چکے ہیں۔ میں آپ کو یہ لکھنا بھول گئی تھی کہ ہم کھانا بھی ساتھ کھائیں گے۔"

"کیا آپ اس ہوٹل میں۔" انور چونک کر بولا۔

"جی ہاں۔۔۔ کیوں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے چھپکلیوں اور چوہوں کا قورمہ قطعی مرغوب نہیں۔" وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"بھئی آپ ٹھہرے بڑے آدمی۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "ہم غریب لوگ تو یہی سب کچھ کھانے کے عادی ہیں۔"

انور اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر جم گئیں جو سنگِ مرمر کے تراشوں کی طرح سبک اور بے داغ تھے۔"

"لیکن آپ کے ہاتھ تو یہ نہیں کہتے۔" انور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

اُس نے چونک کر اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" وہ اسے گھور کر بولی۔

"یہی کہ آپ کے ہاتھ کام کرنے کے عادی نہیں معلوم ہوتے۔"

”خیر ہو گا۔۔۔!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”ہمیں کام کی بات کرنی چاہیے۔“

”میں نے آپ کو اس سے روکا تو نہیں۔“ انور نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن کام کی نوعیت جان لینے کے بعد آپ کو انتہائی رازداری سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ایک شریف آدمی کی عزّت کا معاملہ ہے۔“

”آپ کا یہ جملہ قطعی غیر ضروری ہے۔ لوگ میرے پاس رازداری ہی کے لیے آتے ہیں۔“ انور نے خشک لہجے میں کہا۔

لڑکی نے بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اُسے کھول کر انور کے سامنے رکھ دیا۔ انور چونک کر لڑکی کو گھورنے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ کبھی وہ ڈبیا کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی لڑکی کی طرف۔ پھر اس نے ڈبیا سے کوئی چیز نکالی اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا پتھّر تھا۔ جس کی گہرائیوں سے ہری، نیلی اور پیلی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

”سیاہ پکھراج۔۔۔!“ انور آہستہ سے بڑبڑایا۔

”اِسے ستارے کا ٹکڑا بھی کہتے ہیں۔“لڑکی نے کہا۔

”ستارے کا ٹکڑا۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔ یہ اسی نام سے مشہور ہے۔“

انور نے پتّھر ڈبیا میں رکھ کر ڈھکنا بند کر دیا اور استفہامیہ انداز میں لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

”اِسے اِس کے مالک تک واپس پہنچانا ہے۔“لڑکی آہستہ سے بولی۔

”یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتی ہیں۔“

”نہیں! یہ اس طرح اسے واپس کیا جائے کہ خود اسے بھی اس کا علم نہ ہو۔“لڑکی ہچکچاہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔”یعنی اسے وہیں رکھ دینا ہے جہاں یہ رکھا ہوا تھا۔“

”اوہ۔۔۔!“انور کچھ سوچنے لگا۔

”کیا آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔“

"اچھّی طرح سمجھ گیا۔" انور اسے تیز نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ "غالباً یہ چرایا گیا تھا۔"

"نیّت تو یہی تھی مگر اب چرانے والے نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"تو کیا آپ ہی نے۔۔۔!"

"جی نہیں!" وہ انور کی بات کاٹ کر بولی۔ "میرا اس سے کوئی تعلّق نہیں۔ میں ایک دوسرے آدمی کے لیے آپ سے معاملات طے کر رہی ہوں۔"

"لیکن میں نے اس قسم کا کام آج تک نہیں کیا۔"

"معاوضہ معقول ملے گا۔" لڑکی اس کی بات پر دھیان نہ دیتی ہوئی بولی۔

"تو یہ واپس کہاں جائے گا۔" انور نے پوچھا۔

"پہلے آپ اس کا وعدہ کر لیجیے۔"

"آپ بھی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔" انور چڑ کر بولا۔ "میں کیا کوئی بھی اس

کے متعلّق سب کُچھ جانے بغیر کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"خیر۔۔۔ مگر ایک شرط ہے۔ کام نہ کرنے کی صورت میں بھی آپ اخلاقاً اسے راز رکھنے پر مجبور ہوں گے۔"

"منظور۔۔۔!"

"یہ پتھّر ماہر ارضیات پروفیسر تیموری کی ملکیت ہے۔ کم از کم اُن کا نام تو سنا ہی ہو گا۔"

"پروفیسر تیموری۔" انور اپنے حافظے پر زور دینے لگا۔ "وہی تو نہیں جس نے پچھلے سال قیمتی پتھّروں کی بین الاقوامی نمائش میں حصّہ لیا تھا۔"

"وہی۔۔۔ کیا آپ اُس سے واقف ہیں۔"

"نہیں۔۔۔!" انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

"یہ پتھّر ایک شو کیس میں رکھا جائے گا جو اس کے پتھّروں کے ذخیرے والے

کمرے میں رکھا ہے۔"

"ہوں۔۔۔!" انور مُسکرا کر بولا۔ "تو گویا آپ مُجھے چوری کے الزام میں گرفتار کرانا چاہتی ہیں۔"

"آپ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہیں۔" لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں آپ کو ان حالات میں کبھی نہ بھیجوں گی کہ آپ پکڑے جا سکیں۔"

"یعنی۔۔۔!"

"آج رات کو پروفیسر گھر پر نہیں ہو گا۔ اس کی واپسی کل شام سے پہلے ناممکن ہے۔"

"خوب۔۔۔!" انور میز پر جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"وہ بہت شکّی آدمی ہے۔ اس لیے اس کے گھر میں نوکر نہیں ہیں۔ صرف ایک معتبر سیکریٹری ہے جو پتھّروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔"

"اچھّا اگر اسی معتبر سیکریٹری سے شرف ملاقات حاصل ہو گیا تو۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"سیکریٹری بھی آج رات کو موجود نہ رہے گا۔"

"آپ سب کُچھ جانتی ہیں۔" انور نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "جب اتنی آسانیاں موجود ہیں تو آپ خود ہی یہ سب کام کیوں نہیں کر ڈالتیں۔"

"بعض حالات کی بناء پر میں خود ایسا نہیں کر سکتی۔"

"عجیب بات ہے۔" انور نے کہا اور کُچھ سوچنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "معمولی چوروں کی طرح کسی مکان کا تالا توڑنا پسند نہیں کرتا۔"

"تالا توڑنے کو کون کہتا ہے۔" وہ اِٹھلا کر بولی۔ "آپ تالے کھول کر مکان کے اندر داخل ہوں گے۔"

"یعنی۔۔۔!"

”میرے پاس کُنجیاں موجود ہیں۔“

”آپ کو کوئی دشواری نہ ہو گی۔ مکان دریا کے کنارے ایک غیر آباد مقام پر ہے۔ سونا گھاٹ پر۔ وہاں صرف وہی ایک کوٹھی ہے جس کے گرد آموں کا باغ ہے۔ صدر دروازہ مشرق کی جانب ہے جس کی کُنجی یہ رہی۔ اس کے بعد ایک بڑا کمرہ ہے غالباً وہ بھی مقفّل ہو گا۔ لہٰذا اس کی کُنجی بھی آپ لے سکتے ہیں۔ اُسی کمرے میں داہنی طرف ایک دروازہ ملے گا یہ بھی مقفّل ہو گا اور یہی اس کمرے کا دروازہ ہے جس میں پتھّروں کا ذخیرہ ہے۔“

انور خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے میز پر تین کُنجیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”بہت خطرناک کام ہے۔“ انور آہستہ سے بولا۔ ”لیکن پروفیسر تیموری جائے گا کہاں۔“

”تارجام کے پہاڑی علاقے میں۔ وہ آج صُبح چلا بھی گیا۔“

”وہاں کیا کرنے گیا ہے۔“

”وہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے اُسے بھی اُسی کی طرح پتھّروں سے دلچسپی ہے اور وہ اس کا کاروبار بھی کرتا ہے۔“

”اُس کا نام۔۔۔!“

”نکولس۔۔۔وہ عیسائی ہے اور وہاں اس کا شوروم بھی ہے۔“

”سیکریٹری کہاں جائے گا۔۔۔؟“ انور نے پوچھا۔

”اس کے متعلّق مُجھے علم نہیں لیکن اس کی عدم موجودگی کا سو فیصدی یقین ہے۔“

”اس پتھّر کے متعلّق اور کُچھ نہیں بتا سکتیں۔“

”مُجھے افسوس ہے۔“

”مُجھے اس سے زیادہ افسوس ہے۔“ انور اُٹھتا ہوا بولا۔

”مسٹر انور۔۔۔!“ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔۔ لہجے میں اِلتجا تھی۔ ”یہ ایک شریف آدمی کی عزّت کا معاملہ ہے۔ مُجھے پورا یقین تھا کہ آپ تیّار ہو جائیں گے۔“

”میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔“

”آپ کی ہر شرط مُجھے منظور ہو گی۔“

انور کو دفعتاً اپنے بینک بیلنس کا خیال آ گیا۔ جو روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چند لمحے لڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر بیٹھ گیا۔

”خیر میں کوشش کروں گا۔“

”اس کے لیے آپ کتنا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔“ لڑکی کے لہجے میں خُوشی کی کپکپاہٹ تھی۔

”معاوضے کی باتیں بعد میں ہوں گی۔ ابھی صرف میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے اگر کامیاب ہو گیا تو خیر ورنہ آپ کی چیزیں کل دوپہر تک واپس کر دوں

گا۔"

"چلیے منظور! میں آپ کو کل اسی وقت یہاں ملوں گی۔"

"مجھے اِس کے لیے مجبور نہ کیجیے۔" لڑکی نے کہا اور ہوٹل کے لڑکے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ انور نے کُنجیاں اور ڈبیا اٹھا کر جیب میں ڈال لیں۔

"میرا فون نمبر ۲۴۰ ہے۔" انور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ واقعی کھانا نہ کھائیں گے۔" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں اور آپ کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بھی محض دکھاوے کے لیے اپنا معدہ خراب نہ کیجیے۔"

"دکھاوے کے لیے کیوں؟"

"آپ کا تعلّق حقیقتاً اس طبقے سے نہیں جس میں آپ خود کو کھپانا چاہتی ہیں۔"

"تو کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔

”قطعی نہیں! یہ محض میرا اندازہ ہے۔“ انور نے سنجیدگی سے کہا اور ہوٹل سے نکل کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر داہنی طرف مُڑ گیا۔ کُچھ ہی دور آگے چل کر وہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں گھُس گیا۔

”سعید۔۔۔!“ اس نے ایک لڑکے کو آہستہ سے پکارا۔ شہر میں متعدد جگہوں پر اُس کے گرگے موجود تھے۔ یہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ اس قسم کے لوگ چھوٹی چھوٹی رقموں کے عوض اُس کی مدد کرتے تھے اور پھر انہیں یہ بھول جانا پڑتا تھا کہ انہوں نے کبھی اس کا کوئی کام کیا تھا۔

شوروم

"سعید! تمہارے لیے فی الحال ایک معقول آمدنی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔"

انور نے کہا۔

"فرمایئے صاحب۔"

"اسی لائن میں مدینہ ہوٹل ہے نا۔۔۔ وہاں کیبن نمبر ۵ میں ایک لڑکی کھانا کھا رہی ہے تمہیں اس کے متعلّق معلومات بہم پہنچانی ہیں۔"

"اچھّا صاحب۔۔۔!"

”لیکن جلدی کرو! وہ سفید ساری اور پیازی بلاؤز پہنے ہوئے ہے۔“

سعید باہر چلا گیا اور انور نے دوسرے لڑکے کو بلا کر لنچ کا آرڈر دیا۔ کھانا کھا چُکنے کے بعد وہ کافی کی پیالی اور سگریٹ کے ہلکے ہلکے کشوں سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ اُسے یقین تھا کہ سعید کافی دیر میں آئے گا کیونکہ وہ اس قریب وجوار کی رہنے والی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس گھٹیا سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا نہ کھاتی اور اُسے پورا پورا یقین تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلّق نہیں رکھتی۔ اس کی توقعات کے خلاف سعید آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر واپس آ گیا۔

”صاحب۔۔۔ وہ اگلے چوراہے تک پیدل ہی گئی۔ اس کے بعد فرنچ لانڈری کے سامنے والی گلی میں مُڑ گئی۔ کُچھ دور چل کر ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھی اور نہ جانے کدھر نکل گئی۔ وہاں مُجھے کوئی ٹیکسی بھی نہ مل سکی کہ اس کا پیچھا کرتا۔“

انور نے بُرا سا منہ بنایا۔

”کیوں کار میں کوئی اور بھی تھا۔“

"جی نہیں۔۔۔وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔"

"کار کا نمبر کیا ہے۔"

"جی ہاں وہ تو میں نے لکھ لیا تھا۔" وہ اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بولا۔

"خیر تم نے یہ کام عقل مندی کا کیا۔" انور نے اس کے ہاتھ سے پرچہ لیتے ہوئے کہا۔ پرچے پر ایک نظر ڈال کر اس نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

"یہ لو۔۔۔!" اُس نے پانچ کا ایک نوٹ لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور اب اسے بھول جاؤ۔"

ریستوران سے اُٹھ کر وہ آفس آیا۔ رشیدہ دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اسی کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ انور کو دیکھتے ہی وہ برس پڑی۔

"اگر تم لنچ کے وقت واپس نہیں آسکتے تھے تو تمہیں کہہ کر جانا چاہیے تھا۔"

”تم خواہ مخواہ میرا انتظار کیا کرتی ہو۔“ انور نے خشک لہجے میں کہا۔

”تو کیا آفس میں لڑنے کا ارادہ ہے۔“

”آفس کیا میں ہر جگہ لڑنے پر آمادہ رہتا ہوں۔“

”میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”بہت اچھّا کیا۔۔۔ اکثر دوپہر کا کھانا گول کر جانے سے معدہ ٹھیک رہتا ہے۔“

”خیر! تم مضحکہ اڑالو۔۔۔ لیکن کسی دِن تمہارے معدے کا بھی معقول علاج کر دیا جائے گا۔“

”تم مُجھے دھمکانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ میں ایک ہفتہ تک بغیر کھانا کھائے زندہ رہ سکتا ہوں۔“

”تم ہو خاصے جنگلی جانور۔۔۔ ریگستانی اونٹ۔“ رشیدہ نے جھجھلا کر کہا۔

”رشّو ڈارلنگ۔۔۔۔!“ انور رومانٹک انداز میں بولا۔

”میں کسی قسم کی چاپلوسی کے لیے تیّار نہیں۔“

”میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی سے مل کر آ رہا ہوں۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”صبر کرو۔“ انور اتنے دردناک لہجے میں بولا کہ رشیدہ کے سکڑے ہوئے ہونٹوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ کی لرزشیں نظر آنے لگیں۔

”اچھّا تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں یہی کہنے کے لیے آیا ہوں کہ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں تارجام جا رہا ہوں۔“

”جاؤ دفان ہو۔“ رشیدہ جلدی سے بولی۔ لیکن پھر انور کو گھورنے لگی۔ ”کیوں تارجام کیوں جا رہے ہو۔۔۔؟“

”ایک دلچسپ کیس ہاتھ آ گیا ہے۔“

”کیس ہی کیس ہاتھ آیا ہے یا کُچھ ملنے کی بھی اُمّید ہے۔“

”نہیں یہ کام تو میں فی سبیل اللہ کر رہا ہوں۔“ انور کے چہرے پر معصومیت پھیل گئی۔

”ہو گا۔۔۔ مُجھے کیا۔“ رشیدہ اٹھتی ہوئی بولی۔ ”میں کھانا کھانے جا رہی ہوں۔“

”میں تمہیں روک تو نہیں رہا ہوں۔“ انور نے کہا اور سگریٹ کے لیے جیب ٹٹولنے لگا۔

پھر پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے سرے کو اسی طرح دیکھنے لگا جیسے اس میں سے کسی ہاتھی کے برآمد ہونے کی توقّع رکھتا ہو۔ رشیدہ کُرسی کھسکا کر جانے لگی۔

”ٹھہرو۔۔۔!“

رشیدہ پلٹ کر اُسے گھورنے لگی۔ انور نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکرا نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”تمہیں اس نمبر کی کار کا پتہ لگانا ہے۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس خوبصورت لڑکی سے میں نے کُچھ کاروباری باتیں کی تھیں۔“

”کی ہوں گی۔ مُجھے اس سے کیا غرض۔“

”خیر تو اسے اِدھر لاؤ۔“ انور کاغذ کا ٹکڑا پھر جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ ”تم جا سکتی ہو۔“

”نہیں جاتی۔“ رشیدہ تیز لہجے میں بولی۔ ”تم آخر اتنے تحکمانہ لہجے میں کیوں گفتگو کرنے لگے ہو۔“

”اس لیے کہ میں آج کل ڈونگرے کا بال امرت استعمال کر رہا ہوں۔ جاؤ نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

”دیکھو۔۔۔میں تمھیں یہیں آفس میں چانٹا مار دوں گی۔“

”اور میں یہیں آفس میں تمہارا مقبرہ بنا کر قوّالی شروع کر دوں گا۔“

”جنگلی۔۔۔!“ رشیدہ پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

انور سگریٹ سلگا کر دو تین لمبے لمبے کش لیے اور کھڑا ہو کر کُچھ سوچتا رہا پھر وہ بھی دروازے کی طرف بڑھا۔ نیچے فٹ پاتھ پر موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پیٹرول کی ٹنکی کھول کر پیٹرول دیکھا اور پھر دوسرے لمحے میں موٹر سائیکل سڑک پر فرّاٹے بھرنے لگی۔ باٹم روڈ کے چوراہے پر پیٹرول پمپ سے اس نے کُچھ اور پیٹرول لیا اور تار جام والی سڑک پر گاڑی موڑ دی۔ تین بج چُکے تھے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ پانچ بجے تک تار جام ضرور پہنچ جائے گا۔ راستہ اس سے کم وقفے میں بھی طے ہو سکتا تھا لیکن آگے چل کر پہاڑی علاقہ شروع ہو جانے کی وجہ سے سڑک ناہموار ہو گئی اور کہیں کہیں تو اتنے خطرناک موڑ تھے کہ ذرا سی لغزش سوار اور سواری دونوں کو پاتال کی سیر کرا سکتی تھی۔

تار جام شہر سے پورے ساٹھ میل کے دوری پر واقع تھا۔ اب سے دس سال قبل یہ ایک بالکل ہی اُجاڑ علاقہ تھا۔ کہیں کہیں ندیوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ وہ بھی دس بارہ جھونپڑوں سے زیادہ کے نہ ہوں گے۔ اچانک دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اس کے دِن پھر گئے۔

ویسے تو جنگ سے قبل ہی سے ماہرینِ ارضیات کا خیال تھا اس علاقے میں لوہے اور کوئلے کی کانیں موجود ہیں لیکن کوئی کان کنی کے لیے تیّار نہ ہوا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی اس چیز کی طرف دھیان دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوہے کے کئی کارخانے قائم ہو گئے۔ پھر رفتہ رفتہ ایک چھوٹا موٹا شہر آباد ہو گیا۔ انور دو ایک بار اس طرف آ چکا تھا اس لیے وہ زیادہ احتیاط کے ساتھ موٹر سائیکل نہیں چلا رہا تھا۔ یہاں کے سارے خطرناک موڑ اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ تار جام سے تین میل ادھر ہی اسے سڑک کے کنارے ایک بڑا سا بورڈ دکھائی دیا۔ یہ نکولس کے شوروم کا بورڈ تھا۔ انور بے اختیار چونک پڑا۔ شہر کے باہر شوروم قائم کرنے کا مقصد اس کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک

چھوٹی سی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں کی زمین ہموار تھی۔ اس لیے انور نے موٹر سائیکل کا رُخ عمارت کی طرف پھیر دیا۔ جیسے ہی وہ عمارت کے قریب پہنچا ایک جھکّی سا بُوڑھا آدمی اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک میلی سی فوجی وردی پہن رکھی تھی منہ میں بھدّا سا پائپ دبا ہوا تھا۔ گھنی مونچھوں کے سفید بال جن کے نچلے حصّے سُرخی مائل تھے بل کھا کر نچلے ہونٹ کو چھو رہے تھے۔ سفید بھوؤں کے نیچے سُرخ سُرخ آنکھیں حد درجہ خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور گالوں کی ہڈّیوں کے اُبھار پیشانی کی سطح سے بھی آگے نکلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"کیا بات ہے۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"مُجھے مسٹر نکولس سے ملنا ہے۔" انور نے کہا اور مشین بند کر دی۔

بُوڑھا عمارت کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے ہٹ گیا۔

"تم چوکیدار ہو۔" انور نے آہستہ سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔!“ وہ کڑے لہجے میں بولا۔ ”حوالدار میجر۔“

انور کو بے اختیار چارلی چپلن یاد آ گیا۔ لیکن اس نے اپنے قہقہے کو ہونٹوں تک نہ آنے دیا۔ موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ ایک وسیع کمرے میں چاروں طرف مختلف قسم کے معمولی اور غیر معمولی پتھّروں کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ قیمتی اور چھوٹے ٹکڑے عموماً شیشے کے شوکیسوں میں نظر آ رہے تھے۔ سامنے غالباً دوسرا کمرہ تھا جس کے دروازے میں سیاہ رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر سے کُچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ دفعتاً ایک دبلا پتلا آدمی پردہ ہٹا کر شوروم میں داخل ہوا۔ وہ انور کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میں ادھر سے گذر رہا تھا۔“ انور ہچکچاتا ہوا بولا۔ ”آپ کا سائن بورڈ دیکھ کر بے چین ہو گیا۔۔۔یعنی۔۔۔میں۔۔۔میں۔۔۔“

”آپ کو پتھّروں سے دلچسپی ہے۔“ آنے والے نے مُسکرا کر جملہ پورا کر دیا۔

”جی ہاں۔۔۔جی ہاں۔“ انور جلدی سے مضطربانہ انداز میں بولا۔

”شوق سے۔“ اس نے چاروں طرف ہاتھ گھماتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔

انور پتھّروں کو بغور دیکھنے لگا۔ آنے والا اُسے توجّہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انور پورے کمرے کا چکر لگا کر ایک بڑے شو کیس پر دوبارہ جھک گیا۔ ایک سیاہی مائل پتھّر اُس کی توجّہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

”کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں کیا بتاؤں۔“ انور اس کی طرف مڑ کر متاسفانہ انداز میں ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

وہ استفہامیہ انداز میں انور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں اس پتھّر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔“

”آنے والا شو کیس پر جھک گیا۔ پھر انور کی طرف دیکھنے لگا۔“

”میرا مطلب۔۔۔ یہ کہ۔۔۔ کاش اس کی سیاہی اور گہری ہوتی۔“ انور بے ساختہ

بولا۔

"سیاہ پکھراج۔"

وہ اُسے چونک کر دیکھنے لگا اور دوسرے کمرے میں بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ انور نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بھاری بھر کم آدمی اسے گھور رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان میں رہی ہو گی۔ قویٰ مضبُوط تھے اور سر غیر طور پر بڑا تھا اور آنکھیں اسی حد تک چھوٹی تھیں۔ بھوؤں میں ایک آدھ سفید بال بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سفید قمیض اور سفید پتلون میں ملبوس تھا نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی انور کے ذہن میں ہاتھی کا تصوّر بیدار ہو گیا۔

"آپ سیاہ پکھراج کی بات کر رہے تھے۔" وہ انور کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہوا آہستہ سے بولا۔

"جی ہاں۔۔۔ تھوڑی بہت۔۔۔ ابھی نیا نیا شوق ہے۔"

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔۔مُجھے جاوید کہتے ہیں۔“

”خوب۔۔۔!“ وہ مُسکرا کر بولا۔ ”غالباً آپ شہر ہی میں رہتے ہیں۔ کبھی میرے یہاں تشریف لائیے۔ سونا گھاٹ پر تیمور منزل میں رہتا ہوں۔ مُجھے بھی پتھّروں سے دلچسپی ہے۔ مُجھے لوگ پروفیسر تیموری کہتے ہیں۔“

”اوہ بڑی خُوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ انور لہک کر بولا۔ ”میں نے پتھّروں کی بین الاقوامی نمائش کے سلسلے میں آپ کے متعلّق پڑھا تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج اتنے بڑے آدمی سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔“

”پروفیسر تیموری فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔ لیکن انور کو اس کی ننھّی ننھّی آنکھوں میں چھپی ہوئی بے چینی صاف نظر آرہی تھی۔ انور تھوڑی دیر خاموش رہ کر دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔“

”میں کسی دِن ضرور آؤں گا۔۔۔میں کوئی ذی حیثیت آدمی نہیں ہوں لیکن شوق کو کیا کیا جائے۔ ابھی میرے پاس بہت زیادہ قیمتی پتھّر نہیں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ ضرور تشریف لایئے۔“ وہ تاجرانہ خوش اخلاقی کے ساتھ بولا۔ ”یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر شوق شروع میں کم مائیگی کا شکار رہتا ہے۔“

”بر سبیل تذکرہ۔“ پروفیسر تیموری بولا۔ ”کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے۔“

”ذریعہ معاش۔۔۔!“ انور شرماتا ہوا بولا۔ ”نہ پوچھیے تو بہتر ہے۔“

”پھر بھی۔۔۔!“

”ردّی کاغذ کا بیوپاری ہوں۔“

”بہت اچھّا ہے۔۔۔ بہت اچھّا۔“ دوسرا آدمی اپنی دانست میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوا بولا۔ ”آپ اس تجارت میں کروڑپتی بھی ہو سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ انور مُسکرا کر بولا۔ ”ظاہر ہے کہ ہم لوگ ایک ہی شہر کے باشندے ہیں اور مُجھے مچھلیوں کے شکار کا بھی شوق ہے۔ ممکن ہے آپ نے مُجھے سونا گھاٹ پر دیکھا ہو۔“

پروفیسر تیموری نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ کُچھ مشکوک نظر آرہا تھا۔ انور نے زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔

”اچھّا۔۔۔ اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔“ انور نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ دوسرا آدمی دیر تک دہراتا رہا۔

انور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے جا ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک کڑکڑاتی سی آواز سُنائی دی۔

”اٹینشن۔۔۔!“

انور چونک پڑا۔ میلی وردی والا بُوڑھا منہ میں پائپ دبائے ہوئے اس کی طرف

بڑھ رہا تھا۔

"تم نے مُجھے چوکیدار کہا تھا؟" اُس نے چندر موہن مرحوم کی طرح جہانگیرانہ انداز میں پوچھا۔

"مُجھے دھوکہ ہوا تھا۔" انور آہستہ سے بولا۔

"میں حوالدار میجر ہوں۔ حوالدار میجر شمشیر سنگھ۔" بُوڑھے نے اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"اچھّا آداب عرض۔ میجر صاحب۔" انور نے مُسکرا کر کہا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

"کوئیک مارچ۔۔۔!" بُوڑھا حلق کے بل چیخا۔ لیکن مشین کے شور میں اس کی آواز بھر نہ سکی۔

انور شہر کی طرف واپس جا رہا تھا۔ لڑکی کے قول کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیکن نکولس کا شوروم اُسے اُلجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔ آخر شہر سے دور ویرانے میں

شو روم قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شو روم عموماً ایسے بازاروں میں ہوتے ہیں۔ جہاں زیادہ سے زیادہ گاہک متوجّہ ہو سکیں۔ اگر شہر میں اس کا کوئی شو روم موجود ہوتا تو تار جام والے شو روم کو اسٹور بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ خیر یہ سب چیزیں تو الگ رہیں۔ انہیں نکولس کی جھک بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یا کوئی کاروباری مصلحت۔ لیکن وہ لڑکی کون تھی۔ اس کا پروفیسر تیموری سے کیا تعلّق ہو سکتا ہے۔ وہ کالا پتھّر اس کے ہاتھ کیسے لگا اور پھر جب وہ پروفیسر اور اس کے سیکریٹری کے پروگرام سے واقف تھی اس کے مکان کی کُنجیاں اس کے پاس تھیں تو پھر خود اُسی نے اس پتھّر کو واپس کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ جب یہ معاملہ اتنا ہی سنگین تھا کہ اس نے اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمّت نہیں کی تو پھر ایک اور راز دار بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ جیسے جیسے انور ان چیزوں پر غور کر رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔

آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی تاریکی نے اُسے اپنے دامن میں چھپایا۔

غیر متوقّع حادثہ

گھر پہنچ کر اس نے سارے حالات رشیدہ کو بتا دیئے اور وہ پتھّر بھی دکھایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم روز بروز اتنے بے وقوف کیوں ہوتے جا رہے ہو۔“ رشیدہ جھلا کر بولی۔

”کیوں۔۔۔؟“

”مُجھے تم سے اس کی توقّع نہیں تھی کہ تم کوئی ایسا کیس بھی لے لو گے جس کے لیے تمہیں چوروں کی طرح گھروں میں گھسنا پڑے۔“

”ذرا سوچو یہ چیز کتنی شاندار ہو گی کہ میں ایک چرائی ہوئی چیز چوروں کی طرح واپس کرنے جاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم کسی زبردست جال میں پھنسنے والے ہو۔“

”ممکن ہے۔“

”میں تمہیں ہرگز اس کی رائے نہ دوں گی۔“

”تمہاری رائے کی پرواہ کون کرتا ہے۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔!“ رشیدہ چیخ کر بولی۔ ”تمہیں میری رائے کی پرواہ کرنی پڑے گی۔“

”چہ۔۔۔ چہ۔۔۔۔!“ انور افسوس کرتا ہوا بولا۔ ”تم بہت چیخنے لگی ہو۔ یہ چیز تمہاری صحت پر بُرا اثر ڈالے گی۔“

”جتنا دِل چاہے مضحکہ اڑاؤ لیکن میں تمہیں ہرگز نہ جانے دوں گی۔“

"اس لیے میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" انور معصومیت سے بولا۔

"دیکھو انور۔۔۔ کہیں مجھے سخت نہ ہو جانا پڑے۔"

"تم ویسے بھی زیادہ نرم تو نہیں ہو۔ خُدا جانے تانبے کی ہو یا لوہے کی۔"

"چُپ رہو۔"

"نہیں چُپ رہوں گا۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ نہ الجبرا ہوا اور نہ جیو میٹری۔"

"بس کرو۔۔۔ یہ بے تکی بکواس۔ جس کا نہ سر نہ پیر۔ دُنیا سمجھتی ہے انور بڑا عقل مند ہے۔ بڑا ذہین ہے۔ میری جوتیوں کے طفیل میں بچے ہوئے ہو میاں۔۔۔ ورنہ جیل میں سڑتے ہوتے۔"

"رشّو۔۔۔!" انور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"کیا ہے۔۔۔؟" رشیدہ کے لہجے میں جھلّاہٹ تھی۔

"تم اپنی جوتیاں چھوڑ کر فوراً میرے کمرے سے نکل ہو جاؤ۔"

”کیا مطلب۔۔۔!“

”اگر تمہاری جوتیاں میری کامیابیوں کی ضامن ہیں تو مجھے قطعی تمہاری ضرورت نہیں۔ تمہاری جوتیاں ہی کافی ہیں جو فضول ٹائیں ٹائیں کر کے وقت نہیں ضائع کرتیں۔“

”میں پھر کہتی ہوں کہ تم صُبح سے پہلے ان کمروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

”آخر تم اتنی ضدّی کیوں ہو گئی ہو۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری عقل کہیں چرنے گئی ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ لڑکی جو تمہیں پروفیسر کے مکان کی کُنجیاں تک دے سکتی ہے جو اتنا جانتی ہے کہ آج رات بھر پروفیسر کا مکان خالی رہے گا اس نے خود ہی یہ کام کیوں نہ سر انجام دے ڈالا۔ آخر خواہ مخواہ تمہیں بیچ میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔“

”میں بھی اسی اُلجھن میں ہوں۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

”اور اس کے باوجود بھی تم وہاں جانے کے لیے تیّار ہو۔“

”اگر تم مُجھے کوئی مشورہ نہیں دے سکتی تو یہاں سے چلی جاؤ۔“

”ارے! تو کیا میں اتنی دیر سے جھک مار رہی تھی۔“

”قطعی جھک مار رہی تھیں۔ مشورے آندھی اور طوفان کی طرح نہیں دیئے جاتے۔“ انور ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ”واقعات سُننے کے بعد ہی تم بُری طرح برس پڑیں اور مُجھے بھی تاؤ آگیا۔ میں اسی چیز کے متعلّق تم سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ لڑکی خود ہی اس پتھّر کو اس کے مالک تک کیوں نہیں پہنچادیتی۔“

رشیدہ خاموش ہو گئی۔ شاید اُسے خود اپنے رویّے پر افسوس ہو رہا تھا تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”مُجھے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تمہیں پھانسنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ یہاں کے مجرم ہی نہیں بلکہ پولیس والے بھی تمہارے دُشمن ہیں۔ تمہیں ہر وقت محتاط رہنا چاہیے۔“

انور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر بعد آہستہ سے بولا۔

رشیدہ کے چہرے سے فکر مندی اور جھلّاہٹ کے سارے آثار غائب ہو گئے۔

”سنور شّو۔۔۔!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ پتھّر بہت قیمتی ہے بلکہ بعض جوہری تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ابھی تک اس کی کوئی قیمت ہی متعیّن نہیں ہو سکی۔ شاید اب سے دو سال پہلے میں نے ایسے ہی ایک سیاہ پکھراج کے متعلّق اخباروں میں پڑھا تھا۔ مدارس کے کسی جوہری کے یہاں چوری ہوئی تو اس کے یہاں سے ایک سیاہ پکھراج بھی چُرایا تھا۔ جوہری کو جب یہ معلوم ہوا کہ سیاہ پکھراج بھی چُرا لیا گیا ہے تو اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ تم خود سوچو کہ وہ چیز کتنی قیمتی ہو سکتی ہے جس کے ضائع ہو جانے پر اس کا مالک صدمے کی وجہ سے مر جائے۔“

انور خاموش ہو گیا۔۔۔ اس کی آنکھیں رشیدہ کے داہنے شانے پر جمی ہوئی تھی۔

”تو پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”یہی کہ میں یہ پتھّر نہ تو پروفیسر تیموری کے گھر پہنچاؤں گا اور نہ فی الحال اُس لڑکی

کو واپس دوں گا۔ اب میں یہ پتہ لگانے کی کوشش کروں گا کہ وہ لڑکی کون ہے اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ دراصل وہ مجھے پھنسانا چاہتی تھی تو پھر پتھّر ہماری ملکیّت ہو گا کیا سمجھیں۔"

"خیال تو کچھ بُرا نہیں۔" رشیدہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "لیکن نہیں۔۔۔ میں تمہیں یہ پتھّر بھی نہ رکھنے دوں گی۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"بس یونہی۔۔۔!" رشیدہ نرم لہجے میں بولی۔ "کبھی تو میری بات مان لیا کرو۔"

"تم جو کہو گی وہی کروں گا۔" انور نے مُضمحل آواز میں کہا۔ "لیکن مجھے یہ تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ اس سازش کی پشت پر کون ہے۔"

"میں اس کے لیے منع نہیں کرتی۔"

"تم بہت اچھّی ہو۔۔۔ سچ مچ تم مُجھ سے بہت محبّت کرتی ہو۔"

”خیر تمہیں اس کا احساس تو ہوا۔“

”مگر مُجھے تم سے ذرّہ برابر محبّت نہیں۔“

”میں خود نہیں چاہتی کہ کوئی کٹ کھنّا کتّا مُجھ سے محبّت کرے۔“ رشیدہ نے کہا اور انور کو قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی فلیٹ میں چلی گئی۔

انور کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور ٹہل ٹہل کر پینے لگا۔ دیوار سے لگا ہوا کلاک نو بجا رہا تھا سگریٹ ختم کرنے کے بعد اس نے کپڑے اُتار کر شب خوابی کا لباس پہن لیا اور آرام کُرسی پر لیٹ کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔

گیارہ بجے اس نے بجلی بجھا دی اور آہستہ سے باہر نکل آیا۔ رشیدہ کے فلیٹ میں اندھیرا تھا شاید وہ سو گئی تھی۔ انور اندر لوٹ آیا۔ باہر والے کمرے میں اُس نے دوبارہ روشنی نہیں کی۔ اندر کمرے میں جا کر اُس نے کپڑے پہنے اور احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا پھر باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد گیراج سے موٹر سائیکل نکال رہا تھا۔

سونا گھاٹ والی کچی سڑک سنسان پڑی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ رات یوں بھی تاریک تھی۔ بادلوں کی وجہ سے ستاروں کی دھندلی روشنی بھی غائب ہو گئی تھی۔ سڑک کے گرد اُگی ہوئی جھاڑیاں حشرات الارض کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔

انور نے موٹر سائیکل سونا گھاٹ کے ادھر ہی ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا دی اور پیدل چلنے لگا۔ تیمور منزل کے تاریک آثار دور سے نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں انور کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بہت ہی پُراسرار عمارت میں داخل ہوتا جا رہا ہے اور وہاں ضرور کوئی حادثہ پیش آئے گا۔ اُسے پروفیسر تیموری کا چہرہ یاد آ گیا۔ چھوٹی چھوٹی دھندلی آنکھیں جن کی دُھندلاہٹ اپنے پس منظر میں کوئی پُراسرار چیز چھپائے ہوئے تھی۔ انور اس وقت سوچ رہا تھا کہ اس نے تار جام میں سیاہ پتھّر کا تذکرہ چھیڑ کر غَلَطی کی تھی۔ اگر واقعی یہ پتھّر پروفیسر تیموری کے یہاں سے چرایا گیا تھا تو سیاہ پتھّر کے تذکرے پر اس کا

مشکوک ہو جانا قطعی قدرتی امر ہے۔ پھر کئی خدشات اُس کے ذہن میں ابھر آئے جنہیں وہ سگریٹ کے گہرے کشوں سے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

پروفیسر تیموری کی پچھلی زندگی سے اُسے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ ویسے آج کل شہر اور اس کے قریب و جوار کے حصوں میں وہ کافی مالدار سمجھا جاتا تھا۔ ارضیات پر اس نے دو تین کتابیں بھی لکھی تھیں اور ارضیات کے طلباء میں غیر معروف نہیں تھا۔ کسی زمانے میں یونیورسٹی میں ارضیات کا معلّم بھی رہ چکا تھا۔ شہر میں اس کے دو تین بنگلے تھے لیکن سب کرائے پر اٹھے ہوئے تھے اور وہ خود ایک غیر آباد مقام پر اقامت گزیں تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا عمارت درختوں کی اوٹ میں چھپتی جا رہی تھی۔ وہ پھاٹک کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اُس نے پھاٹک کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل رَوِش تھی۔ جس کے دونوں طرف اُونچے اونچے درخت تھے۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ رَوِش کا سلسلہ عمارت کے صدر دروازے کے سامنے ختم ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا اور سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ مکان کے اندر

بھی زندگی کے آثار مفقود معلوم ہو رہے تھے کسی کھڑکی یا روشن دان سے بھی روشنی نہ دکھائی دی۔ انور ایک لمحہ کھڑا کُچھ سوچتا رہا پھر جیب سے کُنجیاں نکال کر انہیں آزمانے لگا۔

دروازہ کھل گیا۔۔۔ اندر اندھیرا تھا۔۔۔ انور نے برقی لیمپ نکالا اور اس کی مدہم اور نا قابل انتشار روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ ایک وسیع ہال سے گزر رہا تھا۔ آگے چل کر داہنے ہاتھ پر ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا انور نے دوسری کُنجی لگائی۔ دروازہ کھل گیا انور اندر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ کہیں کھڑکھڑاہٹ کی آواز سُنائی دی۔ وہ دیوار سے چپک گیا اور پھر اچانک اس کی قوّت شامہ نے ایک خاص قسم کی خوشبو کا تجربہ کیا اس نے نتھنے سکوڑ کر ایک گہرا سانس لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس خوشبو کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینے کی کوشش کر رہا تھا

وہ آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اُس کی ٹارچ کی روشنی داہنی طرف پڑی۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اسی طرف وہ شوکیس رکھا ہوا ملا جس میں

وہ پتھّر رکھنا تھا۔ اُس میں کئی خانے تھے جن میں مختلف قسم کے پتھّروں کے ننّھے ننھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے اور ہر خانے کے نیچے پتھّروں کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خانہ خالی تھا جس کے نیچے "سیاہ پکھراج" تحریر تھا۔

انور نے شوکیس کھول کر پتھّر اس میں رکھ دیا اور واپس ہونے کے لیے مُڑا لیکن ٹارچ کی روشنی کمرے کے فرش پر پڑتے ہی یک بیک اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ پروفیسر تیموری زمین پر چت پڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوفناک حد تک پھیل گئی تھیں۔ چہرے پر آخری وقت کی تشنجی کیفیت نہ مٹنے والے نشانات چھوڑ گئی تھیں۔ سر کے نیچے کافی مقدار میں خون پھیلا ہوا تھا۔ انور نے ٹارچ بجھا دی اور کُچھ سننے لگا۔ دور کہیں موٹر کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ وہ تیزی سے شوکیس کے قریب آیا اور جیب سے رومال نکال کر اُسے صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد پھر اُس نے چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا جس کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ یہ شاید پروفیسر کے سونے کا کمرہ تھا۔ پلنگ کے سرہانے ایک بڑے سے فریم میں کسی عورت کا فوٹو لگا ہوا تھا۔

خدوخال کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت عورت کہی جاسکتی تھی۔ رنگت چاہے جیسی رہی ہو۔ اس تصویر کے علاوہ یہاں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔

جسے آرائشی سمجھا جاسکتا۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ انور نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور ٹارچ کی روشنی میں کھڑکی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اُس کے ہونٹ مایوسانہ انداز میں سکڑ گئے۔ لیکن یہاں وہ قاتل کا پتہ لگانے تو نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے سب کُچھ اُسے پھنسانے کے لیے کیا گیا ہو۔ انور واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مکان کے کسی حصّے میں قدموں کی آہٹیں سُنائی دی۔

"یہ تو بالکل اندھیرا ہے۔" ایک آواز سُنائی دی اور انور چونک پڑا۔ یہ محکمہ سُراغ رسانی کے انسپکٹر آصف کی آواز تھی۔ انور نے کھڑکی پر دونوں ہاتھ ٹیک کر دوسری طرف چھلانگ لگادی۔

چہار دیواری پھلانگنے میں اسے کوئی دقّت نہ ہوئی اور وہ اب اپنی پوری قوّت سے اُس کی طرف دوڑ رہا تھا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپائی تھی۔

جاسوس کی دھمکی

انور تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ رشیدہ نے اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ چھ بج گئے تھے۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہے؟"

"انسپکٹر آصف۔۔۔!" رشیدہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔۔۔!" انور نے لاپرواہی سے کہا اور پھر لیٹ گیا۔ "اُس سے کہہ دو کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا۔"

"مگر میرے ننّھے گُڈّے تم نے وہ حرکت کی ہے کہ تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔"

"کیا۔۔۔؟"

"پروفیسر تیموری کو کسی نے قتل کر دیا۔"

"میرے لیے یہ خبر بہت پرانی ہو چکی ہے۔" انور نے لاپروائی سے کہا اور تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا۔

"لیکن کُچھ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی خبر ہے۔"

"کیا۔۔۔؟"

"یہ اسی سے پوچھنا۔۔۔! اُس نے اس کے علاوہ مُجھے اور کُچھ نہیں بتایا۔"

"ہوں۔۔۔!" انور اٹھتا ہوا بولا۔ "اُسے یہیں بلا لو۔"

رشیدہ چلی گئی اور انور نے سگریٹ سلگا کر سلیپنگ گاؤن پہن لیا۔ انسپکٹر آصف کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ انور نے کُرسی کی طرف

اشارہ کیا۔

"کل شام کو تم کہاں تھے۔" آصف نے پوچھا۔

"جہنّم میں۔۔۔!" انور جھلّا کر بولا۔ "تُم جب بھی ملتے ہو اسی قسم کے بے سروپا سوالات کرنے لگتے ہو۔"

"ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں بے سروپا سوالات نہیں کر رہا ہوں۔"

"بکے چلو۔۔۔!" انور آہستہ آہستہ ناک سے سگریٹ کا دھواں نکالتا ہوا بولا۔

"مُجھے اس وقت افسوس معلوم ہو رہا ہے کہ تم میرے گہرے دوست ہو۔" آصف چہرے کو مغموم بنا کر بولا۔

"بہتر یہی ہو گا کہ تم مرثیہ خوانی شروع کر دو اور میں ماتم کروں۔ لیکن ہاتھ میرے اور سینہ تمہارا۔"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" آصف سنجیدگی سے بولا۔ "پروفیسر

تیموری قتل کر دیا گیا۔"

"بڑاافسوس ہوا۔ کیا تمہارا کوئی رشتے دار تھا۔" انور نے معصومیت سے پوچھا۔

"کل شام کو تم کہاں تھے۔" آصف نے پھر پوچھا۔

"تار جام میں۔"

آصف اچھل پڑااور رشیدہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"کیا کرنے گئے تھے۔"

"اونٹ خریدنے۔۔۔!" انور نے سنجیدگی سے کہا اور ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ لگانے لگا۔ پھر رشیدہ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "رشّو چائے یہیں منگوالو، شاید ابھی آصف صاحب نے بھی ناشتہ نہیں کیا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔ "میری اتنی خواہش ہے کہ تم اس وقت مُجھ سے سنجیدگی سے گفتگو کرو۔"

"تم کسی اخبار کے رپورٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتے۔"

"اس گفتگو کی حیثیت سرکاری نہیں بلکہ دوستانہ ہے۔" آصف نے نرم لہجے میں کہا۔

"کُچھ بھی ہو۔۔۔میں اپنے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہوں۔"

"اور اگر میں بھی اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا شروع کر دوں تو۔"

"تب تم ایک اچھّے لڑکے کہلاؤ گے۔" انور نے کہا اور درویشانہ شان بے نیازی سے آصف کی طرف دیکھنے لگا۔

"انور میں سچ کہتا ہوں کہ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

انور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتر کر دِل کا حال جاننے کے لیے کوشش کر رہا ہو۔

"پروفیسر کب اور کِن حالات میں قتل ہوا۔ کیا اس کی لاش تارجام میں کہیں پائی

گئی۔" انور نے پوچھا۔

"کیوں تم نے یہ کیوں پوچھا؟ بھلا پروفیسر تیموری کا تار جام سے کیا تعلّق۔۔۔؟"
آصف نے پوچھا۔

"وہ کل مُجھے تار جام میں ملا تھا۔" انور نے کہا۔

"کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے۔"

"نہیں کل ہی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کی تھی۔"

"اور اپنا نام غَلَط بتایا تھا۔" آصف بے ساختہ بولا۔ لیکن اُس نے جس مقصد کے تحت ایسا کیا تھا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ وہ سمجھا تھا کہ انور اس کی معلومات پر اچھل پڑے گا۔ خوفزدہ نظر آئے گا مگر ایسا نہ ہوا۔

انور اَدھ کھلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اور کُچھ۔۔۔۔!" وہ مُسکرا کر بولا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تُم نے اسے غَلَط نام کیوں بتایا تھا۔“

”تمہارے اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا پہلے تم یہ بتاؤ کہ اس کی لاش کہاں پائی گئی۔“

”اُس کے گھر میں۔“

”اوہ۔۔۔!“ انور کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ کُچھ سوچنے لگا۔ آصف جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم تارجام سے یہاں کس وقت آئے تھے۔“

”سات بجے۔“

”اس کے بعد کیا کرتے رہے۔“

”رشیدہ سے لڑتا رہا۔۔۔ پھر تقریباً دس بجے سو گیا۔“

”اور اتنی دیر تک سوتے رہے۔“

”میں سات بجے سے پہلے کبھی بستر نہیں چھوڑتا۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس قسم کے سوالات سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تم خود کب سے تار جام نہیں گئے۔“

”چھ ماہ قبل گیا تھا۔“

”وہاں تم نے شہر سے تین میل ادھر ہی کوئی شوروم دیکھا تھا۔۔۔؟“

”میں قطعی سنجیدہ ہوں۔“ انور نے کہا۔ ”جواہرات اور دوسرے غیر معمولی پتھّروں کا شوروم۔“

”کیا۔۔۔؟ تم نے کہا تھا کہ تار جام سے تین میل ادھر ہی۔ گویا کہ ویرانے میں جواہرات کا شوروم۔۔۔ ہونہہ۔“

”کیوں؟ ویرانے میں تمہیں جواہرات کا شوروم مضحکہ خیز کیوں لگ رہا ہے۔“ انور نے کہا۔

”دیکھو فضول باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔“

"خیر اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو اسی وقت تار جام روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں راستے ہی میں 'نکولس اینڈ کو' کا سائن بورڈ نظر آجائے گا۔"

"خیر ہو گا بھئی! مُجھے اس سے کیا۔" آصف اُکتا کر بولا۔

"صرف اتنا بتادوں کہ وہاں اس شوروم کا وجود حیرت انگیز ہے یا نہیں۔"

"اگر ہے تو یقیناً حیرت انگیز ہے۔۔۔!"

"تار جام سے واپسی پر میں وہاں گیا تھا۔ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

"یقیناً۔۔۔!"

"ٹھیک۔۔۔ تو جس وقت میں اندر پہنچا پروفیسر تیموری دوسرے کمرے میں کسی آدمی سے جھگڑا کر رہا تھا۔"

"دوسرا آدمی کون؟"

”میرا خیال ہے وہی نکولس تھا۔“

”ہوں۔۔۔ آگے کہو۔“

”ظاہر ہے کہ وہاں پہنچنے پر مُجھے بھی قیمتی پتھّروں سے دلچسپی لینی پڑی اور اپنا نام بھی غَلَط بتانا پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر تیموری نے اپنا نام بتایا اس سے قبل میں اسے اچھّاخاصاڈاکو اور خونی سمجھتا رہا تھا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”کیا وہ صورت سے خوفناک نہیں معلوم ہوتا۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔ پھر۔۔۔!“

”پھر یہ کہ میں وہاں سے واپس گیا اور یہ تہیّہ کر لیا کہ اس شوروم کو بے نقاب کیے بغیر نہ مانوں گا۔ وہاں یقیناً کوئی خوفناک حرکت ہو رہی تھی۔۔۔ اور اس وقت تم پروفیسر تیموری کے قتل کی خبر سنا رہے ہو۔ تو گویا میرا اندازہ قطعی درست نکلا۔“

آصف کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں یہ تو بتاؤ تمہیں اس کا علم کیسے ہوا کہ کل میں تار جام گیا تھا۔"

"مُجھے پروفیسر تیموری نے تار جام سے فون کیا تھا کہ انور یہاں مُجھ سے پُر اسرار حالات میں ملا ہے۔ میں رات کو گھر نہیں واپس جاؤں گا لہٰذا تم میرے مکان کی حفاظت کا کوئی انتظام کر دو۔"

"تو گویا آپ مُجھے چور اور ڈاکو بھی سمجھنے لگے ہیں۔" انور نے کہا۔

"شاید وہ تمہیں پہچانتا تھا۔۔۔ اور تمہارے غَلَط نام بتانے پر مشکوک ہو گیا۔ اس کے گھر میں بھی تو کافی جواہرات موجود ہیں۔"

"لیکن یہ بھی عجیب چیز ہے۔" انور نے کہا۔ "تار جام والا شوروم بھی ویرانے میں ہے اور پروفیسر تیموری بھی شاید ویرانے ہی میں رہتا ہے۔"

"میں کل شام ہی سے ایک ضروری کام میں مشغول تھا۔" آصف اس کی بات سنی ان سنی کر کے بولا۔ "اس لیے میں نے پروفیسر کی بات پر دھیان نہ دیا اور ویسے

بھی مُجھے یقین تھا کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتے جس سے قانوناً گرفت میں آ جانے کا امکان ہو۔ بہر حال میں کافی رات گئے تک مشغول رہا۔ پھر اچانک مُجھے خیال آیا کہ مُجھے سونا گھاٹ کا ایک چکّر لگالینا چاہیے۔ اگر پروفیسر واپس آ گیا ہو گا تو بُرا مانے گا۔ میری اس کی خاصی دوستی تھی۔"

آصف خاموش ہو کر انور کی طرف دیکھنے لگا۔ انور خاصی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

"میں دو تین آدمی ساتھ لے کر سونا گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔" آصف نے کہنا شروع کیا۔ "تیمور منزل کا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور عمارت بالکل تاریک تھی۔ مُجھے کُچھ شُبہ ہوا اور ہم اندر چلے گئے۔ صدر دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پھر ہم اس کمرے میں پُہنچے جہاں پروفیسر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے پتھّر توڑنے والے ہتھوڑے سے اس پر حملہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے موت ہتھوڑے کی متعدد ضربات سے واقع ہوئی۔ سر کی کئی ہڈّیاں ٹوٹ گئی ہیں۔"

"کیا وہ گھر میں تنہا رہتا تھا۔" انور نے پوچھا۔

”نہیں اس کے ساتھ اس کا سیکریٹری حامد بھی رہتا تھا۔ لیکن وہ کل رات کو گھر پر نہیں تھا۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”اس کا بیان ہے کہ وہ پروفیسر سے چھٹّی لے کر گیا تھا۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ پروفیسر خاصا احمق تھا۔“ انور نے کہا۔ ”پہلے اس نے سیکریٹری کو چھٹی دی اور پھر خود مکان اکیلا چھوڑ کر تار جام چلا گیا۔ تاکہ معمولی سا چور خفیف سی جدوجہد کے بعد اُس کے سارے جواہرات مار لے جائے۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم سے فون پر بات کرنے والا پروفیسر تیموری تھا۔“

”میں جلدی میں تھا اس لیے اُس کی طرف دھیان نہیں دے سکا اور پھر اس وقت اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔“

”سیکریٹری واپس کب آیا۔۔۔؟“

”آج چار بجے صُبح۔“

”تم نے اُسے حراست میں نہیں لیا۔“

”میں اس پر غور کر رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔ ”لیکن تم مُجھے خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا کر پہلو بچانا چاہتے ہو۔“

”کیا مطلب۔۔۔!“ انور اُسے گھور کر بولا۔

”تم اس حادثے کے متعلّق کُچھ جانتے ہو۔“

”جو کُچھ جانتا تھا میں نے بتا دیا۔“

”تم آخر یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تم تار جام کیوں گئے تھے۔“

”میں۔۔۔!“ انور متحیّر ہو کر بولا۔ ”شاید تم گھاس کھا گئے ہو۔ بھلا میں تار جام کیوں جانے لگا۔“

”ابھی خود تم نے اس کا اعتراف کیا ہے۔“

”مُجھے یاد نہیں۔“

”خیر! لیکن یہ مت بھولو کہ پروفیسر نے کل مُجھے تار جام سے تمہارے متعلّق فون کیا تھا۔ تم اسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”تم نے خواب دیکھا ہو گا۔ خیر عدالت تمہارے اس خواب کو دلچسپی سے سنے لگی۔ فی الحال مُجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تمہارے محکمے کے سپرنٹنڈنٹ صاحب اس بات کی شہادت دیں گے کہ کل میں دو بجے سے دس بجے تک ان کے ساتھ رہا۔“

”کیا مطلب۔۔۔!“ آصف چونک کر بولا۔

”مطلب یہ میری جان کہ وہ میری بیوی کا سالا ہے۔“ انور آنکھ مار کر کہنے لگا۔

”فی الحال تمہاری کوئی دُکھتی رگ میری ہاتھ میں نہیں ہے اس لیے اسے استعمال کروں گا۔“

"خیر اچھّا ہوا کہ تم نے پہلے ہی بتا دیا۔۔۔ اس کا بھی انتظام کر لیا جائے گا۔" آصف اٹھتا ہوا بولا۔

"اررر۔۔۔ بیٹھو نا بھئی۔ رشیدہ چائے لا رہی ہو گئی۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔" آصف ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

"تمہاری مرضی۔" انور نے اپنے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

اتنے میں رشیدہ چائے لے کر آ گئی۔

"آصف صاحب چائے نہیں پیئیں گے۔" انور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"مُجھ سے کہہ رہے تھے مُرغے کی بولی بولو۔ میں نے معذوری ظاہر کی اس پر بگڑ گئے۔"

”دیکھو انور میں بتائے دیتا ہوں۔“ آصف غُصّے میں اس کے آگے اور کُچھ نہ کہہ سکا۔

”ابھی نہیں پھر کسی وقت بتا دینا۔“ انور نے لاپروائی سے کہا اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

”یہ کسی دِن بڑی مُصیبت میں پھنس جائے گا۔“ آصف نے رشیدہ سے کہا۔

”میری بلا سے۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ ”مگر میں تو یہ دیکھتی آرہی ہوں کہ یہ ہمیشہ دوسروں ہی کو مُصیبت میں پھنسا دیتا ہے۔“

”کب تک۔۔۔ خیر کی ماں کب تک بکرے کی۔۔۔ کہنے کا مطلب یہ کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“

”بہر حال میں آپ کے لیے بھی چائے لائی ہوں۔“ رشیدہ مُسکرا کر بولی۔

”تم اسے سمجھاؤ۔“ آصف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ میرے بس کا روگ نہیں۔۔۔ لیکن معاملہ کیا ہے۔“

”وہ پروفیسر تیموری کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات جانتا ہے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔ مُجھے اچھّی طرح اس کا اندازہ ہو گیا ہے وہ کب اوٹ پٹانگ باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔“

اتنے میں انور بھی واپس آ گیا۔ اُس نے آصف کی گفتگو سن لی تھی لیکن وہ کُچھ بولا نہیں۔ تینوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

”ہتھوڑے پر کسی قسم کے نشانات بھی ملے یا نہیں۔“

”نہیں۔۔۔!“

”ہاں میں نے رومال سے اس کا دستہ صاف کر دیا تھا۔“ انور مُسکرا کر بولا۔ آصف نے چڑھ کر اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور رشیدہ بھی اُسے گھورنے لگی۔

”دیکھو میاں آصف میں اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے بعد اُلٹا اُلّو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ مُجھے اپنا بہت سا قرض ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بینک بیلنس بھی کم ہوتا جارہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اگر تم میرے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنا کام دیکھو تو زیادہ اچھّا ہوگا۔“

ایک مرد ایک عورت

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ میں تاش کے دو پتے ہیں۔ پہلا نکولس اور دوسرا اسیکرٹیری۔ میرے ساتھ مغزمارنے سے بہتر تو یہی ہے کہ تم انہیں کریدنے کی کوشش کرو۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ آصف ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

”ایک چیز اور۔۔۔!“ انور نے آہستہ سے کہا۔ ”پروفیسر نے تم سے کہا تھا وہ تار

جام ہی میں رات گذارے گا۔۔۔ پھر واپس کیوں آ گیا۔"

"ممکن ہے بعد کو اُسے خیال آیا ہو گھر سیکریٹری بھی موجود نہیں اس لیے گھر اکیلا نہ چھوڑنا چاہیے۔" آصف نے کہا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اُس نے تار جام جانے سے پہلے ہی سیکریٹری کو چھٹی دے دی تھی۔"

"اس لیے مُجھے پھر کہنا پڑے گا کہ پروفیسر یا تو فرشتہ تھا یا بہت بڑا احمق کیونکہ تیمور منزل کا محل وقوع ایسا ہے کہ وہاں دِن دہاڑے چوری ہو سکتی ہے۔"

ابھی سِلسِلہ گفتگو یہیں تھا کہ ایک پستہ قد مگر مضبُوط جسم کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیص کا سخت کالر دودھ کی طرح سفید اور بے داغ تھا۔ کتھّئی رنگ کی اسپاٹ ٹائی سینے پر لہرا رہی تھی۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا سُبک سا چشمہ تھا۔

"تو میں بالکل ٹھیک وقت پر آیا۔" وہ مُسکرا کر ایک کُرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ پھر

رشیدہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”غالباً چائے دانی خالی نہ ہو گی۔“

انسپکٹر آصف نے اُسے گھور کر دیکھا۔ غالباً اُسے اس کی بے تکلّفی ناگوار گزری تھی۔

”میں آپ لوگوں کی مشغولیت میں مخل تو نہیں ہوا۔“ وہ آصف اور انور کی طرف دیکھ کر بولا۔

”قطعی نہیں۔“ انور نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”آپ سے کیا پردہ مغل شہنشاہوں کے شاہی محلات میں خواجہ سراؤں کی پوری پوری آزادی تھی۔“

آنے والا رشیدہ کی طرف دیکھ کر بے ڈھنگے پن کے ساتھ ہنسنے لگا۔ رشیدہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چائے کی پیالی لینے چلی گئی۔ آصف ابھی تک اُسے گھورے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کی موجودگی پسند نہیں کرتا۔ آصف اُس سے سچ مچ متنفّر تھا اور اس کی وجہ اس کے پیشے کی گندگی تھی۔ وہ روزنامہ ”پوسٹ

مارٹم"کا ایڈیٹر تھا۔ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بلیک میلنگ تھی وہ اسے اخبار کے ذریعے اُونچے طبقے کے لوگوں کے پرائیویٹ معاملات پبلک کے سامنے لا کر یا لانے کی دھمکی دے کر خاصی رقمیں پیدا کر لیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا طریقہ کار کُچھ ایسا تھا کہ وہ براہ راست قانون کی زد میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی بڑے آدمی کے پیچھے پڑ جاتا اور انور سے بھی وہ اسی مقصد کے تحت ملتا رہتا تھا کہ شاید اُس سے اُسے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جسے وہ اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا سکے۔ ویسے وہ انور سے ڈرتا بہت تھا۔ اس خوف کی وجہ انور کی غیر ذہانت اور فطری بے مروّتی تھی۔

رشیدہ کی واپسی پر وہ کُرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور رشیدہ اس کے لیے چائے انڈیلنے لگی۔

"کیوں قدیر۔۔۔؟ کوئی نئی چیز۔۔۔!" انور نے اُس سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ انسپکٹر صاحب تمہیں کوئی نئی خبر ہی سنانے آئے ہیں۔" قدیر

مُسکرا کر بولا۔

”اچھّا بھئی اب میں چلوں۔“ آصف اٹھتا ہوا بولا۔ ”آج شاید دِن بھر تیں سونا گھاٹ پر ہی رہوں اگر فرصت ہو تو اس طرف بھی چلے آنا۔“

”کوشش کروں گا۔“ انور نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ آصف تم سے مدد لینے آیا تھا۔“ قدیر بولا۔

”مُجھے تمہارے اس جاننے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ انور نے لاپروائی سے کہا اور خیالات میں ڈوبا ہوا ناک سے آہستہ آہستہ سگریٹ کا دھواں نکالنے لگا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پروفیسر تیموری کا سیکریٹری کل رات کو کہاں تھا۔“

”کہاں۔۔۔؟“ انور چونک کر بولا۔

”ابھی یہ نہیں بتا سکتا۔ اگر ان لوگوں سے سودا طے نہ ہوا تو میں تمہیں سب کُچھ بتا دوں گا۔“

”کِن لوگوں سے۔“

”ابھی کس طرح بتا سکتا ہوں۔“

”خیر ہو گا۔۔۔ میں تمہاری تجارت میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔“ انور اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں اس وقت بہت زیادہ مشغول ہوں۔“

”کوئی بات نہیں! تم جا سکتے ہو۔۔۔ میں رشیدہ صاحبہ سے گپ لڑاؤں گا۔“ قدیر نے کہا۔

”میں معافی چاہتی ہوں۔۔۔ مُجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔“

”خیر خیر۔۔۔ نہ جانے کیوں مُجھے آپ لوگوں سے اتنی محبّت ہو گئی ہے۔“

”شکریہ شکریہ۔۔۔!“ انور منہ سکوڑ کر بولا۔

قدیر اٹھ کر چلا گیا۔

”تم سچ مچ بڑی احمق ہو۔“

”کیوں۔۔۔!“ رشیدہ تنک کر بولی۔

”تمہیں اُسے روک کر اُس سے سب کُچھ اگلوا لینا چاہیے تھا۔“

”میں نہیں پڑتی اس چکّر میں۔“

”خیر ہو گا۔۔۔!“ انور نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ ”اس نمبر کی کار کے مالک کا پتہ لگانا ہے۔“

”پھر تم نے وہی شروع کیا۔“

”جان من! انور بُری طرح پھنس گیا ہے۔ کل رات کو اگر مُجھ سے ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو آصف مُجھے لاش کے سرہانے ہی پکڑ لیتا۔“ انور نے کہا اور پچھلی رات کی داستان دہراتا ہوا بولا۔ ”اب میرا وہی خیال ہے جو تمہارا تھا کہ مُجھے کوئی پھنسانا چاہتا ہے۔“

”ابھی کیا ہے۔“ رشیدہ بزرگانہ انداز میں بولی۔ ”ابھی اور دھکّے کھاؤ گے خیر اب تو کُچھ نہ کُچھ کرنا ہی پڑے گا۔ لاؤ کاغذ مُجھے دو۔“

تھوڑی دیر کے بعد دونوں آفس چلے گئے۔ رشیدہ کو چھُٹّی دِلا کر انور اپنے روزانہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ کلاک نے گیارہ بجائے اس نے کاغذات ایک طرف رکھ دیئے اور کُچھ سوچنے لگا۔ آج ایک بجے کے بعد اُسے کل والی پُر اسرار لڑکی سے ملنا تھا لیکن اسے سو فیصدی یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نظر نہ آئے گی۔ آخر وہ کون تھی؟ کیا اس پتھّر ہی سے پروفیسر کی موت کا تعلّق تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ درمیان میں کیوں ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے اور پروفیسر کے کسی پُر اسرار تعلّق کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ لیکن یہ چیز بالکل ہی مہمل تھی۔ پھر اچانک اُسے اس پتھّر کا خیال آ گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا اور نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو۔۔۔ اوہ معاف کیجیے گا۔ مُجھے غَلَط فہمی ہوئی تھی۔" انور نے ریسیور رکھ دیا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اسے پروفیسر تیموری کے فون نمبر کی تلاش تھی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو۔۔۔ کیا آپ پروفیسر تیموری کے گھر سے بول رہے ہیں۔ اچھّا اچھا۔۔۔ ذرا انسپکٹر آصف صاحب کو فون پر بلا دیجیے۔“ وہ خاموش ہو کر بائیں ہاتھ سے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگا۔ ”ہیلو آصف! میں بول رہا ہوں۔۔۔ کوئی نئی بات۔۔۔؟ آخر اس قتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ کوئی چیز غائب بھی نہیں ہوئی۔۔۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ جواہرات بھی بدستور ہیں؟ سیکریٹری سے تو پوچھو۔۔۔ اچھّا یہی اُسی کا بیان ہے۔۔۔ خیر میں تم سے کسی وقت وہیں ملوں گا۔“

انور ریسیور رکھ کر پھر اپنے دفتری کاغذات میں ڈوب گیا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے رشیدہ واپس آئی۔

”خبر۔۔۔؟“ انور اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولا۔

”خبر تو ہے مگر بتاؤں گی نہیں۔“ رشیدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”رشّو۔۔۔!“ انور پیار بھرے لہجے میں بولا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔ ایک شرط ہے۔“

"کیا۔۔۔!"

"دونوں کان پکڑ کر مُرغے کی بولی بولو۔"

"قریب آؤ۔۔۔ زور سے نہیں بولوں گا۔۔۔" انور نے رشیدہ کے کان مضبُوطی سے پکڑ لیے اور آہستہ سے بولا۔ "ککڑوں کوں۔" اور پھر جھٹکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ رشیدہ کھڑی بسورتی رہی اور وہ لکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے کُچھ نہ پوچھے گا۔۔۔ لیکن جیسے ہی وہ جانے کے لیے مُڑی انور آہستہ سے بولا۔

"اِدھر آؤ۔۔۔!"

رشیدہ پلٹ کر اُسے گھورنے لگی۔

"اچھّا آؤ اب تم میرے کان پکڑ لو۔۔۔ آ جاؤ۔۔۔ شاباش۔"

"نہیں آؤں گی۔۔۔ نہیں آؤں گی۔" رشیدہ جھلّا کر بولی۔

”تو مُجھے ہی آنا پڑے گا۔“

انور اٹھ کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ رشیدہ تھوڑی دیر تک اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔

”میں کُچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”بولو بھی رشّو۔۔۔!“ انور بچگانے انداز میں بولا۔ ”میں بالکل یہ نہیں سمجھا تھا کہ تم سنجیدگی سے میرے کان پکڑنا چاہتی ہو۔“

”بکو مت۔۔۔!“

”اچھّا لو چپ ہو گیا۔“

”وہ پروفیسر تیموری کی کار کا نمبر تھا۔“ رشیدہ نے کہا۔

”مذاق مت کرو۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ پروفیسر کے پاس دو کاریں تھیں ایک وہ خود اپنے

استعمال میں رکھتا تھا اور دوسری سیکریٹری کے پاس رہتی تھی۔ یہ سیکریٹری ہی والی کار کا نمبر ہے۔"

"میرے خُدا۔۔۔!" انور آہستہ سے بولا۔ "تو کیا۔۔۔ وہ پتّھر سیکریٹری ہی نے چرایا تھا۔ مگر نہیں یہ ناممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اُسے دوبارہ واپس کرنے کے لیے دوسرے سے مدد کیوں لیتا۔"

"رشیدہ خاموش ہو گئی۔" انور پھر بولا۔

"رشّو اس لڑکی کا پتہ لگانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"ہو گا۔۔۔!" رشیدہ بے تعلّقی ظاہر کرتی ہوئی بولی۔

انور نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا۔

"رشّو۔۔۔!" تم پھر کسی وقت میرے کان پکڑ لینا۔ فی الحال میرے ساتھ چلو۔ "انور اُسے دروازے کی طرف گھسیٹتا ہوا بولا۔"

”کہاں۔۔۔؟“

”جہاں میں چلوں۔“

اور پھر انور کی موٹر سائیکل سڑک پر فرّاٹے بھرنے لگی۔ رشیدہ کیریئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم مدینہ ہوٹل کے سامنے ہی ٹھہری رہنا۔ غالباً میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی۔ تمہیں اس لڑکی کا تعاقب کر کے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے۔“

”ہوں۔۔۔ اور اس کی اُجرت۔۔۔!“

”اجرت۔۔۔!“ انور چونک کر بولا۔ ”ایک بہت ہی لذیذ قسم کا چانٹا۔“ رشیدہ نے اُس کی پیٹھ پر گھونسا جڑ دیا اور دو ایک راہ گیر انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

ہوٹل کے کُچھ فاصلے پر انور نے موٹر سائیکل روک لی اور رشیدہ اتر کر دوسرے کنارے کے فٹ پاتھ پر چلی گئی۔

انور ناک بھوں سکوڑتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ معیّنہ کیبن میں ایک آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انور دروازے پر ٹھٹک گیا۔

"کیا آپ مسٹر انور ہیں۔" آدمی آہستہ سے بولا۔

انور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلے آیئے۔۔۔!" وہ بولا۔

یہ ایک دُبلا اور دراز قد آدمی تھا۔ گالوں کی ہڈّیاں ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے عیّاری ٹپکتی تھی۔ چہرے کا پھیکا پھیکا تانبے جیسا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ شراب پینے کا عادی ہے۔ انور اس کے سامنے بیٹھ کر اُسے گھورنے لگا۔

"وہ کُنجیاں دے دیجیے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "وہی کُنجیاں جو کل ایک لڑکی نے آپ کو دی تھیں۔"

"لڑکی۔۔۔ آپ شاید نشے میں ہیں۔"

"میں قطعی ہوش میں ہوں اور کُنجیاں واپس لے کر جاؤں گا۔" اُس نے انور کو گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی اُجرت بتایئے۔"

"کیسی اُجرت۔۔۔ دیکھئے جناب میں اجنبیوں سے بے تکلّف ہونے کا عادی نہیں۔"

"سیدھے ہو جاؤ میاں لڑکے سیدھے۔" وہ تن کر بولا۔ "میں بہت بُرا آدمی ہوں۔"

"وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہے۔"

"انور۔۔۔۔!"

"بد تمیز۔۔۔!" انور تیز لہجے میں بولا۔ "انور صاحب کہو۔"

"اچھّا انور صاحب کُنجیاں واپس کر دیجیے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"ناممکن! ہرگز نہیں۔" انور اٹھ کر کیبن سے نکل آیا۔

”تمہیں پچھتانا پڑے گا۔“ وہ بولا۔

”اس پر پھر کبھی غور کروں گا۔“ انور نے کہا اور چل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب کے ریستوران کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا اشارہ پا کر رشیدہ بھی اس کے پیچھے ہو لی تھی۔ ریستوران میں پہنچ کر وہ اس کی طرف مُڑا۔

”رشّو۔۔۔ وہ نہیں آئی۔ اس کے بجائے ایک مرد آیا ہے۔ تم اس کا پیچھا کرو۔۔۔ وہ ابھی اسی ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ کیبن نمبر پانچ میں۔۔۔ جاؤ جلدی کرو۔“

”مُجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ رشیدہ بولی۔

”جاؤ میں تمہاری طرف سے بھی کھالوں گا۔۔۔ مطمئن رہو۔“

رشیدہ منہ بناتی ہوئی باہر چلی گئی۔ انور دروازے کے قریب ہی کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ کافی کا آرڈر دے کر اس نے سگریٹ سلگایا اور سامنے رکھے ہوئے گُلدان پر نظریں جما دیں۔ لیکن اس کی یہ محبّت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اُسے ایسا

محسوس ہوا جیسے اس کے بائیں گال کے قریب سے ایک پیلے رنگ کی لہر گذر گئی ہو اور ساتھ ایک خاص قسم کی خوشبو۔۔۔ ایک عورت پیلے رنگ کی ساری میں ملبوس کاؤنٹر کی طرف جارہی تھی۔ لیکن وہ خوشبو! وہ خوشبو انور کا ذہن جھنجھلا اُٹھا اور جیسے ہی وہ عورت کاؤنٹر پر دونوں ہاتھ ٹیک کر پیچھے کی طرف مُڑی انور کے سارے جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ گئیں۔ یہ تو وہی تھی بالکل وہی جس کی تصویر اس نے پچھلی رات کو پروفیسر کی خواب گاہ میں دیکھی تھی اور وہ خوشبو۔ کیا اُسی خوشبو نے پچھلی رات کو اس کا ذہن پراگندہ نہیں کر دیا تھا۔ پروفیسر کے مکان کا سنّاٹا اور اندھیرا اُس کے ذہن میں آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔

وہ کُچھ پریشان سی نظر آرہی تھی۔ بار مین نے اس کی طرف وہ گلاس بڑھا دیا جس میں اس نے پیلے رنگ کی شراب کا ایک پیگ انڈیلا تھا۔ عورت نے سوڈے کی بوتل گلاس میں خالی کر دی اور پھر اس بُری طرح گلاس پر ٹوٹ پڑی جیسے وہ بہت پیاسی ہو۔ گلاس ختم کرنے کے بعد وہ ایک خالی میز کے قریب بیٹھ گئی۔ بار ٹینڈر دوسرا گلاس اور سوڈے کی بوتل اس کی میز پر رکھ کر چلا گیا۔

اب وہ شراب کو بے تحاشہ حلق میں انڈیل لینے کے بجائے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور نیم وا آنکھوں سے گلاس کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں بیرا انور کی کافی لے کر آ گیا۔ انور نے عورت کی میز کی طرف اشارہ کیا۔ بیرے نے کافی کی ٹرے اس میز پر رکھ دی۔ عورت بیرے کو گھورنے لگی۔

"میں نے کافی تو نہیں منگوائی۔" وہ حیرت سے بولی۔ قبل اس کے بیرا کُچھ کہتا انور اس کے قریب پہنچ گیا۔

"میں اس وقت کافی ہی پیتا ہوں۔" انور نے آہستہ سے کہا اور کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"مگر آپ۔۔۔!" عورت کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔!" انور نے بیرے کو جانے کا اشارہ کر کے کہا۔ "میں آپ کے لیے اجنبی ضرور ہوں مگر آپ میرے لیے نہیں۔"

”بات یہ ہے کہ پروفیسر تیموری۔۔۔!“

”جی۔۔۔!“ شراب کے گلاس کو اس نے اتنی مضبُوطی سے پکڑ لیا کہ اس کے ہاتھ کی رگیں ابھر آئیں۔

”مطلب یہ کہ آپ پروفیسر تیموری کی دوست تھیں۔“

”جی ہاں۔۔۔جی ہاں۔۔۔!“ وہ جلدی سے بولی۔

”اُسے کسی نے قتل کر دیا۔“

”اوہ۔۔۔جی ہاں۔۔۔میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔“

”اس سے آپ کب ملی تھیں۔“

”لیکن آپ کون ہیں؟“

”پروفیسر تیموری کا ایک ہمدرد۔۔۔!“ انور نے کہا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ آخری بار اُس سے کب ملی تھیں۔“

”مُجھے ٹھیک یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے دس روز قبل۔۔۔ ہو سکتا ہے پندرہ روز قبل۔“

”اور کل رات کو۔۔۔!“

عورت دفعتاً چونک پڑی۔ وہ انور کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”بولیے بولیے۔۔۔!“ انور سر ہلا کر بولا۔ ”میرے پاس اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ آپ کل رات کو تیمور منزل میں تھیں۔“

”یہ سو فیصدی سچ ہے۔“

عورت اُسے تھوڑی دیر تک خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً سنبھل کر بولی۔

”اگر آپ دوسری بار یہ جملہ دہرائیں گے تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔“

”ضرور کیجیے۔۔۔ اس طرح پولیس کو آسانی ہو جائے گی کیونکہ وہ خود آپ کی تلاش میں ہے۔“

سیکریٹری

عورت پھر خوفزدہ نظر آنے لگی۔

"لیکن ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کل رات کو تیمور منزل میں تھیں یا نہیں۔"

"قطعی نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔"

"خیر آپ کی مرضی۔۔۔!" انور لاپروائی سے بولا۔ "لیکن اپنا نام بتانے میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

”گلوریا ٹمو تھی۔۔۔!“

انور نوٹ بک نکال کر لکھنے لگا۔

”کہاں رہتی ہیں۔“

”رحمان لاج۔۔۔ تیسری منزل۔۔۔ روم نمبر پانچ۔“

”شکریہ۔“ انور نوٹ بک جیب میں رکھتا ہوا بولا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن؟“ وہ کُچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

”کیا۔۔۔!“

”کُچھ نہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ انور لاپروائی سے بولا اور کافی کی پیالی خالی کر کے کُرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

وہ انور کو بغور دیکھتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

”میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میری ہی طرح پروفیسر کے درجنوں جان پہچان والے ہوں گے۔ پولیس ان سب کو تنگ کرے گی؟“

”جان پہچان بھی کئی قسم کی ہوتی ہے۔“ انور نے کہا۔ ”ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ لوگ جان پہچان والوں کی تصویریں اپنی خواب گاہوں میں لگاتے ہیں۔“

”جی۔۔۔!“ عورت چونک کر بولی۔

”جی ہاں۔۔۔!“ انور معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پولیس آپ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔“

”لیکن آپ کون ہیں۔“

”کہہ تو دیا کہ پروفیسر کا ایک دوست۔۔۔ میرا پولیس سے کوئی تعلّق نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب کُچھ مُجھے بتا دیں تاکہ میں آپ کو پولیس کی زیادتی سے بچا سکوں۔“

”میں کُچھ نہیں جانتی۔“ عورت جلدی سے بولی۔ ”اور آپ مُجھ پر سراسر الزام لگا

رہے ہیں کہ میں کل رات کو پروفیسر تیموری کے مکان میں تھی۔"

"خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ دیکھا جائے گا۔" انور اٹھتا ہوا بولا۔ "میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ پولیس آپ تک نہ پہنچنے دوں۔"

انور نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور ریستوران سے نکل گیا۔

رشیدہ کا انتظار فضول تھا۔ معلوم نہیں وہ کب تک واپس آئے۔ انور کچھ سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی موٹر سائیکل سونا گھاٹ کی طرف جا رہی تھی اور اس کا ذہن کئی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیمور منزل میں پولیس ڈیرا ڈالے ہوئی تھی۔ انسپکٹر آصف بھی موجود تھا اور بہت زیادہ متفکّر نظر آرہا تھا۔ انور کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھِل گیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

”کوئی نئی بات۔“

”کُچھ نہیں۔۔۔ کوئی نئی بات نہیں۔ میں نے نکولس کو حراست میں لے لیا
ہے۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”شُبہ کی بناء پر۔۔۔واقعی اس کا شوروم انتہائی پُراسرار معلوم ہوتا ہے۔“

”لیکن صرف اس کو حراست میں کیوں لیا۔“

”میں تار جام گیا تھا۔“ آصف کُچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”نکولس کی کل رات کی نقل و
حرکت شُبے میں ڈالنے والی ہے۔“

”یعنی۔۔۔!“

”وہاں سے پروفیسر تیموری کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ بھی چل پڑا۔“

”پھر۔۔۔!“

”ظاہر ہے کہ اگر اُسے بھی شہر آنا تھا تو وہ پروفیسر تیموری ہی کے ساتھ کیوں نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد چلنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ اُس نے عام راستے کے بجائے دشوار گزار راستے اختیار کیے جِن کے ذریعہ وہ پروفیسر سے کُچھ دیر قبل ہی شہر پہنچ گیا تھا۔“

”لیکن تمہیں یہ اِطلّاعات ملیں کہاں سے۔“ انور نے کہا۔

”اس ٹیکسی ڈرائیور سے جو اُسے شہر لے گیا تھا۔“

”ہوں۔۔۔!“ انور کُچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ اُترا کہاں تھا۔“

”رحمان لاج کے قریب۔“

”رحمان لاج۔۔۔!“ انور چونک کر بولا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن تم چونکے کیوں؟“

”کُچھ نہیں۔۔۔ یونہی۔۔۔ تو پھر نکولس نے کیا بتایا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ آسانی سے یہ نہیں بتائے گا کہ وہ تیموری کا قاتل ہے۔“

”بھئی کمال کر دیا۔ محض اتنی سی بات پر تم نے اسے قاتل ہی تسلیم کر لیا۔“ انور ہنس کر بولا۔

”نہیں اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جس ہتھوڑے سے پروفیسر قتل کیا گیا تھا وہ عام استعمال کا ہتھوڑا نہیں۔ یا تو وہ پروفیسر ہی کا ہو سکتا ہے یا پھر اُسی کے کسی دوسرے ہم پیشہ کا۔“

”تمہاری مراد پتھّر توڑنے والے ہتھوڑے سے ہے؟“ انور نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ سیکریٹری نے بتایا کہ وہ پروفیسر کا نہیں تھا۔“

”تو کیا نکولس نے اُسے اپنا ہتھوڑا تسلیم کر لیا۔“

”بھلا وہ کیوں تسلیم کرنے لگا۔“

”تو اس سے تم نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ نکولس ہی کا ہو سکتا ہے۔“ انور بولا۔

"یہ تو اب دیکھا جائے گا۔"

"پروفیسر کا قتل کہاں ہوا۔۔۔؟" انور نے پوچھا۔

"پتھّروں والے کمرے میں۔" آصف نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ دونوں اُس کمرے میں آئے جہاں پچھلی رات کو انور نے پروفیسر کی لاش دیکھی تھی۔ اس وقت اُجالے میں چاروں طرف لگے ہوئے شیشے کے شوکیسوں میں طرح طرح کے خوش رنگ پتھّر جگمگا رہے تھے۔ آصف انور کو وہ جگہ دکھانے لگا جہاں پروفیسر کی لاش ملی تھی۔

"تو تمہیں اچھّی طرح اطمینان ہے کہ یہاں سے کوئی چیز چرائی نہیں گئی۔" انور نے پوچھا۔

"میں یہاں کی چیزوں سے واقفیت تو رکھتا نہیں۔" آصف مُسکرا کر بولا۔ "سیکریٹری کا بیان ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ فی الحال مجُھے اسی کے بیان پر یقین کرنا پڑے گا۔"

"ہوں۔۔۔!" انور کچھ سوچ رہا تھا اور اس کی نظریں شو کیس پر جمی ہوئی تھیں جس میں اس نے پچھلی رات کو سیاہ پکھراج رکھا تھا۔ لیکن اس وقت وہ غائب تھا۔ اس کی جگہ خالی نظر آرہی تھی۔

"سیاہ پکھراج۔۔۔!" انور نے شو کیس پر جھک کر بلند آواز میں کہا۔

"اوں۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔!" آصف چونک کر بولا۔

"شاید یہاں بھی کوئی پتھّر تھا جس کا نام لکھا ہوا ہے۔" انور خالی جگہ کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"ہاں تھا تو۔۔۔ اب وہ تجوری میں رکھ دیا گیا ہے۔" آصف نے کہا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"پتہ نہیں۔۔۔ سیکریٹری نے رکھ دیا ہے۔"

"تمہارے سامنے۔"

”ہاں بھئی ہاں۔“

”تم اس کی قیمت سے واقف ہو۔“ انور نے پوچھا۔

”کیوں یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”اس لیے کہ سیاہ پکھراج آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔۔۔؟“

”ٹھیک ہے۔“ آصف بولا۔ ”آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”سیکریٹری کہاں ہے؟“

”اس کی حالت بہت ابتر ہے۔“

”وہ ہے کہاں۔۔۔؟“

”اپنے کمرے میں؟ بھئی نہ جانے کیوں مجُھے اس پر رحم آتا ہے۔“

”اور مجُھے تم پر رحم آتا ہے۔“ انور ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ ”میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ سامنے والے کمرے میں ہے تم جاؤ۔ میں مرحوم کے سامان کی فہرست مکمّل کر رہا ہوں۔“

”مگر یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“ انور نے کہا۔

”یہ مت بھولو کہ پروفیسر میرا دوست بھی تھا۔“

”اس کا کوئی وارث بھی ہے یا نہیں۔“

”ہے تو۔۔۔ لیکن اس کے متعلّق پروفیسر کے قانونی مُشیر مسٹر پی داس زیادہ بہتر بتا سکیں گے۔“

”اور تم نے ابھی تک اس سے گفتگو نہیں کی۔“

”میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ آج کل شہر میں موجود نہیں ہے۔“

”ہوں۔۔۔!“ انور نے کُچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ تھوڑی دیر تک وہ آصف کو بے خیالی میں گھورتا پھر سیکریٹری کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازہ اندر سے

بند تھا۔ انور نے دستک دی۔

جواب ندارد۔۔۔ اس نے پھر دروازہ تھپتھپایا۔ اندر قدموں کی آہٹ سُنائی دی اور وہ دروازہ کھل گیا۔ انور کے سامنے ایک خوبصورت جوان کھڑا تھا۔ آنکھیں سُرخ اور پلکیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کافی دیر تک روتا رہا ہو۔

"اندر چلیے۔" انور آہستہ سے بولا۔ سیکریٹری ایک طرف ہٹ گیا اور انور کمرے میں چلا گیا۔

"بیٹھ جایئے۔" انور ایک کُرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

سیکریٹری بیٹھ کر انور کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"آپ کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ پروفیسر سے چھُٹّی لے کر گئے تھے۔"

"جی۔۔۔!" سیکریٹری اُسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”جی ہاں۔“

”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”آپ یہاں سے کس وقت گئے تھے۔“

”دس بجے دِن کو۔“

”کہاں گئے تھے؟“

”نشاط نگر اپنی خالہ کے یہاں۔“

”آپ کے استعمال میں وہی کار رہتی ہے جس کا نمبر ۲۳۱۷ ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ اسی کار پر گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”اور وہ کل سے اب تک آپ ہی کے پاس رہی۔“

"جی۔۔۔!" وہ چونک کر بولا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"آپ میری بات کا جواب دیجیے۔"

"نہیں کل یہ میری خالہ کے بھی استعمال میں رہی۔"

"آپ کی خالہ کی عُمر کیا ہے؟"

"مسٹر۔۔۔!" وہ تیز لہجے میں بولا اور پھر انور کو گھورنے لگا۔

"اس سوال کا جواب ضروری ہے؟" انور نے سنجیدگی سے کہا۔

"پچاس یا پچپن سال۔۔۔!"

"ہوں۔۔۔!" اور کُچھ سوچتا ہوا بولا۔ "کیا آپ مکان کی کُنجی اُس لچھّے میں رکھتے ہیں جس میں کار کی کُنجی رہتی ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔!"

"تو کل کُنجیوں کا لچھّا بھی آپ کی خالہ کے پاس رہا ہو گا۔"

”جی ہاں ۔۔۔ مگر کیوں ۔۔۔ مگر کیوں ؟“

”کُچھ نہیں ۔۔۔ کوئی خاص بات نہیں ۔“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔

”کیا میں وہ لچھّا دیکھ سکتا ہوں ۔“

”جی ہاں ۔۔۔ ضرور ضرور ۔“ سیکریٹری نے کہا اور اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

”یہ لیجیے ۔“

”ان میں سے مکان کی کُنجیاں کون کونسی ہیں ۔“ انور نے پوچھا۔

سیکریٹری بتانے لگا۔

”اچھّا یہ تو وہ کُنجیاں ہیں جو آپ کے پاس رہتی تھیں ۔ وہ کُنجیاں کہاں ہیں جو پروفیسر رکھتا تھا۔“

”وہ ان کی جیب میں نہیں ملیں ۔“ سیکریٹری بولا۔

”آپ نے تلاش کی تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ قاعدے کے مطابق انہیں اُن کی جیب میں ہونا چاہیے تھا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کرنے والا اپنے ساتھ وہ کُنجیاں بھی لے گیا۔“

انور بولا۔

”بھلا میں اس کے متعلّق کیا بتا سکتا ہوں۔“

”خیر چھوڑیئے۔۔۔ یہ بتایئے کہ آپ نے وہ سیاہ پکھراج تجوری میں کیوں رکھ دیا ہے۔“

”وہ تجوری ہی میں رہتا تھا۔ پرسوں چند مہمانوں کو دکھانے کے لیے شو کیس میں لگایا گیا تھا۔“

”مہمانوں کو دکھانے کے لیے؟“

”جی ہاں۔“

”ان مہمانوں کے نام۔۔۔۔؟“

”سیکریٹری نے نام بتانے شروع کیے اور انور اپنی نوٹ بک میں لکھتا گیا۔“

”سر صغیر احمد۔۔۔!“ انور ایک نام پر بڑبڑایا۔ ”نیشنل بینک کا ڈائریکٹر نا۔۔۔؟“

”جی ہاں وہی۔“

”شاید وہ بھی تو پتھّروں کا شوقین ہے۔“

”جی ہاں۔“

”پروفیسر سے اس کے تعلّقات کیسے تھے۔“

”اچھّے خاصے تھے۔“

”لیکن ہم پیشہ اور ہم شوق لوگ ایک دوسرے سے حسد بھی تو رکھتے ہیں۔“ انور بولا۔

”بھلا میں اس کے متعلّق کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”تو وہ پکھراج پرسوں سے آج تک اُسی شو کیس میں رہا۔“

”جی ہاں۔“

انور اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کمرے سے نکل آیا۔

کچھ نئی باتیں!

چار بجے شام کو انور تیمور منزل سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کیس میں اُسے سچ مچ سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا۔ سیکریٹری کا بیان اُلجھا ہوا تھا اور فی الحال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اسے مجرم کیوں نہ سمجھا جائے۔ پتھّر چُرایا گیا تھا۔ لیکن وہ اس بیان کے مطابق دعوت والی رات سے اس وقت تک اسی شوکیس میں موجود رہا۔ پھر دوسری بات یہ کہ اگر وہ تجوری میں رکھا جاتا تھا تو پھر دعوت کے اختتام سے اب تک شوکیس ہی میں کیوں رکھا رہا۔ انور کو افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے اس سے اور سوالات کیوں نہ کیے۔ پھر اس کا ذہن گلوریا کی طرف مُنتقل ہو

گیا۔ اُسے سو فیصدی یقین تھا کہ وہ پچھلی رات کو جائے واردات پر موجود تھی لیکن اس یقین کی بنیاد کسی منطقی دلیل پر نہیں تھی جس خوشبو کا تجربہ اُسے پچھلی رات کو ہوا تھا اس کا استعمال گلوریا کے علاوہ کوئی دوسرا بھی کر سکتا تھا۔ اس امکان کے باوجود بھی وہ نہ جانے کیوں گلوریا کو اس کیس سے متعلّق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پکھراج اسی نے چُرایا ہو اور پھر کسی وجہ سے اُسے واپس کر دینے پر آمادہ ہو گئی ہو۔ اس کام کے لیے اس نے اس لڑکی کو منتخب کیا ہو۔ لیکن نہیں۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ بات تھی تو اس لڑکی کے پاس سیکریٹری کی کار کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خود سیکریٹری بھی ملا ہوا تھا اور اگر یہ درست ہے تو پھر پتھّر کی واپسی کے لیے اُسے ہموار کرنا بالکل ہی احمقانہ فعل تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام خود سیکریٹری ہی انجام دے سکتا تھا۔ پھر اچانک اس کا ذہن ایک دوسرے ہی دھارے پر بہہ نکلا۔ آخر پروفیسر کا قتل کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ سب کُچھ اُسے پھنسانے کے لیے کیا گیا تھا تو اس سازش کی پشت پر کون ہو سکتا ہے اور پھر سوچتے سوچتے اسے اُلجھن ہونے

لگی اور اس نے وقتی طور پر یہ خیال دِل سے نکال پھینکا۔

رشیدہ گھر پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انور نے کمرے میں داخل ہوتے ہی فلیٹ ہیٹ اتار کر دور پھینک دی۔ نشانہ تو میز ہی کا لیا تھا لیکن ہاتھ بہک جانے کی وجہ سے وہ جوتوں کی الماری میں جا گری۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے وہ ایک آرام کُرسی میں دھنس گیا۔

"کیوں؟ کیا کسی نے مرمّت کر دی۔" رشیدہ نے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں میں کسی ایسے کی تلاش میں ہوں جس کی مرمّت کی جا سکے۔"

"آئینہ لا دوں۔" رشیدہ نے بھولے پن سے کہا اور انور گھورنے لگا۔

"رپورٹ۔۔۔!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"بہت اچھّا حضور۔۔۔سُنیے۔۔۔وہ مے پول ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۶ میں رہتا ہے۔ رجسٹر میں اس کا نام وجے کمار ہے۔ ہوٹل میں لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اُس سے کُچھ باتیں کرتا رہا لڑکی خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔ پھر

وہ ہوٹل سے چلی گئی اور میں واپس آگئی۔"

"تم واپس آگئیں۔"

"اور پھر کیا کرتی۔"

"اوہ۔۔۔ تم اتنی اُلّو کیوں ہو گئی ہو۔"

"نہیں تو کہاں۔" رشیدہ حیرت سے اپنا پورا جسم ٹٹولتی ہوئی بولی۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"رشّو۔۔۔!"

"فرمایئے مسٹر انور۔"

"مُجھے غصّہ آجائے گا۔"

"بُری بات ہے۔ بچّوں کو غُصّے سے پرہیز کرنا چاہیے۔" رشیدہ مربّیانہ انداز میں

بولی۔

”رشّو۔۔۔!“ انور جھلّا کر چیخا۔

”انور۔۔۔!“ رشیدہ بھی اسی انداز میں چیخی۔

انور دانت پیسنے لگا۔ رشیدہ اس کی نقل کر رہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے تمہاری شامت آگئی ہے۔“ انور نے کہا۔

”ہاں آئی تو تھی مگر تم سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر کر کے اپنا پتہ چھوڑ گئی۔“

”میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

”بسم اللہ۔۔۔ مگر میز پر نہیں۔ کمزور لکڑی کی ہے۔ میرا خیال ہے دیوار۔۔۔ خیر دیوار ہی سہی۔“

”بکواس بند کرو۔“ انور پھر چیخا۔

”بکواس بند کر دی۔“ رشیدہ بھی اُسی انداز میں چیخی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

انور نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور رشیدہ بلند آواز میں گانے لگی۔

”مان مرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار۔۔۔۔!“

”ارے بند کرو۔۔۔۔بند کرو۔۔۔یہ نفرت آمیز گانا۔“ انور زور سے چیخا۔

”کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار۔۔۔!“ رشیدہ نے پھر ہانک لگائی۔

”میں سچ کہتا ہوں۔“

”مان مرا احسان۔۔۔!“

”چُپ رہو۔“

”ارے نادان کہ میں۔۔۔!“

”ارے چپ ارے چپ۔“ انور کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بولا۔ ”خُدا غارت

کرے اُسے جس نے یہ گیت لکھا تھا۔ جاہل تھا وہ بالکل اُلّو کا پٹھا تھا۔"

"تُجھ سے کیا ہے پیار۔۔۔!"

انور نے جھلّا کر اپنی ٹائی کی گرہ تنگ کرنی شروع کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گلا گھونٹ کر مر جائے گا۔ نہ جانے کیوں اسے گیت حد درجہ نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔

"چچ چچ۔۔۔ ٹائی خوش رنگ بھی ہے۔" رشیدہ اس کے ہاتھ پکڑتی ہوئی بولی۔

"آخر تمہیں اس گیت سے اتنی چِڑ کیوں ہے۔"

"دور ہٹو۔۔۔ دور ہٹو۔۔۔!" انور اٹھتا ہوا بولا۔

"اب مُجھے ان کھڑکیوں میں سلاخیں لگوانی پڑیں گی۔" رشیدہ فکر مند لہجے میں بولی۔

"معلوم نہیں کب پڑوس کے ریڈیو سیٹ پر یہی گیت آنے لگے اور تم کھڑکی سے

چھلانگ لگادو۔"

"تم خُدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔" انور عاجز آکر بولا۔

"میں خود ہی جارہی تھی۔" رشیدہ دروازے کی طرف بڑھی اور تھوڑی دور جا کر پھر پلٹی۔

"جانتے ہو وہ پُر اسرار لڑکی کون ہے؟"

"کیوں خواہ مخواہ مُجھے تنگ کرتی ہو۔" انور کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"اب آئے ہو سیدھی راہ پر۔۔۔ خیر سنو۔۔۔ اس کا نام رابعہ صغیر ہے اور وہ سر صغیر احمد کی لڑکی ہے۔"

"کیا کہا۔۔۔؟" انور اُچھل کر بولا پھر اس کی نظریں رشیدہ کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"کیوں؟ کیا بات ہے۔" رشیدہ نے آہستہ سے پوچھا۔

”بہت بڑی بات۔“ انور کی نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”گرہیں خود بخود کھلتی جارہی ہیں۔ خود بخود کھل رہی ہیں۔“

”تو ٹھیک سے بتاؤ نا۔“

دفعتاً انور چونک کر اپنی نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹا لیں اور پھر اس طرح اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

”معاملہ بہت زیادہ اُلجھا ہوا ہے۔“ انور نے کہا اور رشیدہ کو اپنی سیکریٹری کی گفتگو کے متعلّق بتانے لگا۔

”تب تو معاملہ صاف ہے۔“ رشیدہ بولی۔ ”سیکریٹری بھی ملا ہوا ہے لیکن پروفیسر کے قتل کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا اور اب تو یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ کسی نے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ بھلا صغیر احمد یا اُس کی لڑکی سے تمہارا کیا تعلّق۔“

”یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”ہاں ایک بات تو بھول ہی گئی۔ ایک عورت تلاش کرتی ہوئی آفس پہنچی تھی۔ اپنا نام گلوریا بتایا تھا۔ شاید وہ مناسب حق المحنت کے عوض تم سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔“

”گلوریا؟ کیوں کیا۔۔۔!“ انور کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

”کیا تم اُسے جانتے ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ میری فہرست میں وہ بھی شامل ہے۔“

”بہر حال وہ اپنا پتہ دے گئی ہے۔“

”ہوں۔۔۔!“ انور کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر دفعتاً چونک کر بولا۔ ”میں نے ابھی تک چائے نہیں پی۔“

”لیکن میں نے سُنا ہے کہ تمہارے اُستاد انسپکٹر فریدی کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔“

"وہ عشق کی آخری منزل ہے۔۔۔ میں ابھی تک وہاں نہیں پہنچ سکا۔"

چائے پی چکنے کے بعد وہ رحمان بلڈنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گلوریا اُسے کچھ بتانا چاہتی ہے کوئی اہم بات۔

"تھوڑی دیر بعد وہ گلوریا کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔" دروازہ کھلا اور گلوریا چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ کیوں؟"

"کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"مگر اس وقت یہاں گھر میں مہمان۔۔۔!"

"آپ مطمئن رہیے۔۔۔ آپ کا مہمان محفوظ رہے گا۔"

وہ دروازہ بند کر کے واپس لوٹ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اندر کوئی خاص انتظام کر کے انور کو بلائے گی۔ انور نے دھکّا دے کر دروازہ کھول

دیا لیکن سامنے نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ ایک معمّر آدمی صوفے سے اٹھ رہا تھا۔ انور اسے اچھّی طرح جانتا تھا۔ یہ سر صغیر احمد تھا۔

سر صغیر اپنے سر پر فلیٹ ہیٹ جماتا اور کُچھ بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب سے گذر گیا۔ گلوریا انور کو بُری طرح گھور رہی تھی۔

"میں اس بد تمیزی کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"اور مُجھے آپ کا یہ جملہ بڑا عجیب لگ رہا ہے۔"

"تُم آخر ہو کون۔۔۔؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"آپ تو اس طرح کہہ رہی تھی جیسے میں زبردستی یہاں گھُس آیا ہوں۔" انور نے مُسکرا کر کہا اور اپنا ملاقاتی کارڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"انور سعید۔۔۔!" وہ اچھل پڑی۔ "مگر۔۔۔ مگر۔۔۔!"

"میں آپ کی درخواست پر یہاں آیا ہوں۔"

”اوہ۔۔۔ معاف کیجیے گا۔ آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا تھا۔“

”آپ نے پوچھا ہی کب تھا۔۔۔؟“

”اچھّا تو بیٹھیے۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ انور بیٹھتا ہوا بولا۔

”میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔“

”کس معاملے میں۔“

”پولیس نے نکولس کو پکڑ لیا ہے۔“

”نکولس۔۔۔ کون نکولس۔۔۔!“

”پروفیسر تیموری کا دوست۔۔۔!“

”لیکن اس سے آپ کا کیا تعلّق۔۔۔!“

”میری اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔“

”اوہ۔۔۔وہ کل رات کو یہاں آیا تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔!“

”تو وہ پروفیسر کے ساتھ ہی کیوں نہیں چلا آیا تھا۔“

”وہ نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر کو علم ہو۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”اب میں کیا بتاؤں۔“ وہ بے بسی سے انور کو دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔
”آپ نے میری تصویر پروفیسر کے کمرے میں دیکھی تھی۔“

”ہاں تو پھر۔۔۔!“

”یہ سب میں نے نکولس ہی کے لیے کیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو نکولس کے کاروبار کے لیے روپیہ کہاں سے فراہم ہوتا۔ اسے بھی پتھّروں کا خبط ہے اور اس نے بھی اپنی زندگی پتھّروں کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس کے علاوہ

کُچھ اور جانتا ہی نہیں۔ میں نے پروفیسر تیموری سے اُسے قرض دلوایا تھا اور اسی سے وہ کاروبار کر رہا تھا۔ پروفیسر اس کا گاہک بھی تھا۔"

"کیا پروفیسر کو تم دونوں کے تعلّقات کا علم تھا۔"

"ہاں۔۔۔!"

"اور یہ سر صغیر احمد۔"

"یہ بھی نکولس کے گاہکوں میں سے ہے۔"

"لیکن تمہارا اس سے کیا تعلّق۔"

گلوریا خاموش ہو گئی۔ انور اُسے گھور رہا تھا۔

"کُچھ بھی نہیں۔۔۔کُچھ بھی نہیں۔"

"اچھّا سیاہ پکھراج کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔"

گلوریا بے اختیار چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کی رنگت اُڑنے لگی تھی لیکن اس

نے جلد ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔

”سیاہ پکھراج۔۔۔ کیسا سیاہ پکھراج۔۔۔ میں اس کے بارے میں کُچھ نہیں جانتی۔“

”پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔“

”مسٹر انور۔۔۔ نکولس کو اس مُصیبت سے نجات دلائیے۔ میں آپ سے اِلتجا کرتی ہوں۔“

”تو پھر میں جو کُچھ پوچھتا ہوں تم بتاتی کیوں نہیں۔“

”جو کُچھ میں جانتی تھی میں نے بتا دیا۔“

”تم نے کُچھ نہیں بتایا۔ لیکن تم ایک دِن سب کُچھ بتانے پر تیّار ہو جاؤ گی۔“

گلوریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”کیا تم پروفیسر والی دعوت میں شریک تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ لیکن نکولس وہاں موجود تھا۔“

”سر صغیر اور پروفیسر کے تعلّقات کیسے تھے؟“

گلوریا ایک بار پھر خاموش ہو گئی لیکن اُسے بولنا ہی پڑا، اور وہ کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ لیکن انور کے لیے وہ سب سے بے سود تھیں۔ اس کی دانست میں وہ اس سے کُچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ لڑکی

سات بجتے بجتے انور پھر سونا گھاٹ پہنچ گیا۔ تیمور منزل میں ابھی دو پولیس کانسٹیبل تعینات تھے۔ آصف وغیرہ جا چکے تھے۔ کانسٹیبل دوپہر کو انور اور آصف کو ایک ساتھ دیکھ چکے تھے اس لیے انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انور سیدھا سیکرٹری کے کمرے میں چلا گیا جو اس وقت بھی بند تھا۔ البتّہ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جن سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

انور نے دستک دی اور دروازہ کھل گیا۔ سیکریٹری اُسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی۔

”میں تم سے کُچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجُھے فرصت نہیں۔“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری خالہ۔۔۔!“

”آپ جا سکتے ہیں۔“ وہ بِگڑ کر بولا۔ ”مجُھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا تعلّق پولیس سے نہیں ہے۔“

انور ہنسنے لگا۔۔۔ اور سیکریٹری نے دروازہ بند کر دیا۔ انور تھوڑی دیر تک کھڑا کُچھ سوچتا رہا پھر کھڑکی کے قریب جا کر بولا۔ ”سیکریٹری صاحب آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔۔۔ مجُھے رابعہ صغیر نے بھیجا ہے۔“

دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور سیکریٹری باہر نکل آیا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”تمہاری خالہ رابعہ صغیر نے۔“ انور سنجیدگی سے بولا۔

سیکریٹری دیوار سے ٹِک کر کھڑا ہو گیا۔ انور نے محسوس کیا کہ وہ بغیر سہارے کے نہیں کھڑا ہو سکتا۔

”اندر چلو۔۔۔!“ انور اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا۔

سیکریٹری بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔“

”پولیس کو ابھی اس کی اِطّلاع نہیں کہ تم نے پروفیسر کی اجازت کے بغیر کل رات کو گھر چھوڑا تھا۔“

”تو کیا۔۔۔!“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”رابعہ نے سب کُچھ بتا دیا۔“

”تم نے پولیس سے یہ بات کیوں چھپائی تھی کہ دعوت والی رات کو سیاہ پکھراج گُم ہو گیا تھا اور پروفیسر کی موت کے بعد پھر مل گیا۔“

”اگر رابعہ نے تمہیں سب کُچھ بتا دیا ہے تو اب مُجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”رابعہ نے مُجھے کُچھ بھی نہیں بتایا لیکن اب تمہیں سب کُچھ بتانا پڑے گا۔“

سیکریٹری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”لیکن اتنا یاد رکھو کہ تم جھوٹ بول کر کامیاب نہیں ہوسکتے۔“ انور پھر بولا۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ سیکریٹری گلوگیر آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ”میں نہیں جانتا کہ پروفیسر کو کس نے قتل کیا لیکن یہ جانتا ہوں کہ پتھّر کس نے چرایا تھا۔

”تُم کسی طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرو کہ پروفیسر کا قاتل میں ہی ہوں۔ پتھّر کی بات اندھیرے ہی میں رہنے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ رابعہ منظر عام پر آئے۔ اس سے بہتر میرے لیے پھانسی ہوگئی۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں پہلے ہی سے یہ ساری اسکیم معلوم تھی۔“

”نہیں۔۔۔ بلکہ میں بعد میں ان نتائج پر پہنچا ہوں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں واپس آنے کے بعد تمہیں اس بات کا احساس ہوا کہ تمہیں کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں اس کے متعلّق کُچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ کُچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔ مُجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے پروفیسر سے چھُٹّی نہیں لی تھی۔ لیکن مُجھے یقین تھا کہ وہ رات کو واپس نہیں آسکتے۔“

”تو نشاط نگر جانے سے پہلے تمہیں اس کی اِطّلاع نہیں تھی کہ تم نشاط نگر جاؤ گے۔“

”مسٹر انور آپ یہ سب مت پوچھئے۔ کسی طرح یہ ثابت کر کے مُجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دیجیے کہ میں ہی پروفیسر کا قاتل ہوں۔“

”کیوں؟ تم زندگی سے بیزار کیوں ہو گئے ہو؟“

”میں یہ سوچنے سے پہلے مر جانا چاہتا ہوں کہ جس پر مُجھے اعتماد تھا اس نے مُجھے فریب دیا۔“

”تمہارا اشارہ رابعہ کی طرف ہے۔“

سیکریٹری نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی اور انور سوچنے لگا کہ اسے اداکاری سمجھے

یا حقیقت۔ کیا وہ سچ مچ راست بازی سے کام لے رہا تھا یا رابعہ کو پھنسا کر خود الگ ہو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نے آخر پتھّر کی چوری اور بازیافت کے متعلّق پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔"

"مسٹر انور وہ پروفیسر کی زندگی ہی میں چرایا گیا تھا؟ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنا بیش قیمت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بتایئے کہ خود پروفیسر ہی نے اس کی اِطّلاع پولیس کو کیوں نہیں دی۔"

انور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ظاہر ہے کہ وہ اس کی اِطّلاع پولیس کو نہیں دینا چاہتے تھے۔" سیکریٹری پھر بولا۔

"لیکن وہ پتھّر اسے ملا کہاں سے تھا۔" انور نے پوچھا۔

"مُجھے اس کی اِطّلاع نہیں اور نہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ ان کے پاس کب سے تھا۔"

”دعوت میں رابعہ بھی شریک تھی۔“

”ہاں۔۔۔وہ بھی تھی۔“سیکریٹری نے مضمحل آواز میں کہا۔

”اور دوسری صُبح کو پکھراج شوکیس میں نہیں تھا۔“انور نے کہا۔

”ہاں۔۔۔!“

”اُسے رات ہی کو تجوری میں کیوں نہیں رکھ دیا گیا تھا؟“

”اب اس کے متعلّق میں کیا بتا سکتا ہوں۔میں نے پروفیسر سے کہا بھی تھا لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں اُسے شوکیس ہی میں رہنے دیا جائے۔“

”رابعہ کس وقت تک تمہارے ساتھ نشاط نگر میں رہی۔“

”تین بجے تک۔۔۔بلکہ وہ وہیں رہ گئی اور میں واپس چلا آیا۔مُجھے خوف تھا کہ کہیں پروفیسر صُبح ہی صُبح واپس نہ آجائے۔“

”تُم اسے بہت چاہتے ہو۔“

سیکریٹری خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

"نشاط نگر میں تم کہاں رہے۔" انور نے پوچھا۔

"در حقیقت میری ایک خالہ نشاط نگر میں رہتی ہے لیکن میں نے وہاں رات نہیں گذاری تھی۔"

"پھر۔۔۔!"

"رابعہ کے گھر پر۔۔۔!"

"کیا نشاط میں اس کا کوئی گھر ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ اکثر وہ لوگ تبدیل آب و ہوا کے لیے وہاں جاتے ہیں ویسے وہ عموماً خالی ہی رہتا ہے۔"

"کیا اس سے پہلے بھی تم لوگ اس قسم کی راتیں گذار چکے ہو۔" انور نے پوچھا۔

"کبھی نہیں اور مُجھے اس پر حیرت ہے کہ رابعہ جیسی ڈرپوک اس پر کیسے تیّار ہو گئی

تھی۔"

"تو کیا خود تم ہی نے اس سے اس کے لیے کہا تھا۔"

"قطعی نہیں۔۔۔ یہ تجویز اسی نے پیش کی تھی کہ ہم نشاط نگر میں رات گذاریں۔ حالانکہ اس سے قبل وہ کبھی میرے ساتھ سینما تک نہیں گئی تھی۔ ایسی باتوں پر عموماً خوف ظاہر کیا کرتی تھی۔"

"لیکن نشاط نگر کیوں اتنی آزادی سے چلی گئی۔"

اس نے کہا تھا کہ سر صغیر رات کو گھر پر نہیں رہیں گے۔"

"اوہ۔۔۔!" انور اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ "یہ عجیب اتّفاق ہے کہ وہ اور پروفیسر دونوں بیک وقت رات کو گھر سے باہر رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"تو کیا۔۔۔ تو کیا۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔!" انور ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "کسی قسم کا خیال ظاہر کرنے کی ضرورت

نہیں۔ میرا قطعی یہ مقصد نہیں ہے کہ سر صغیر نے تمہارے ذریعہ پروفیسر کو قتل کرادیا ہو سکتا ہے کہ تمہیں واقعی اس کا علم نہ ہو۔ میں سر صغیر کی طرف سے بہت زیادہ مشکوک ہوں اور پولیس کو بھی اسی راستے پر لگانے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں مسٹر انور۔۔۔ نہیں خُدا کے لیے۔۔۔ اس طرح رابعہ کی بھی بدنامی ہو گی اور میں اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پولیس کے سامنے اعتراف جرم کیے لیتا ہوں اگر آپ نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا اور میرا خون ناحق آپ کی گردن پر ہو گا۔"

"واہ رے میرے شیر۔۔۔!" انور ہنس کر بولا۔ "تُم نے تو فریاد کی بھی قبر پر لات ماردی۔"

"بیسویں صدی میں میں نے ایسا عشق نہیں سنا۔"

"مسٹر انور آپ جاسکتے ہیں۔" سیکریٹری اسے گھورتا ہوا بولا۔

"ظاہر ہے کہ میں یہاں رات نہیں بسر کروں گا۔" انور مُسکرا کر بولا۔

"مُجھے آپ سے ہمدردی کی توقّع ہے۔"

"ہمدردی کی توقّع اُسی وقت رکھ سکتے ہو جب سب کُچھ صحیح صحیح بتا دو۔"

"اور کیا میں ابھی تک جھک مار رہا تھا۔" سیکریٹری نے بگڑ کر کہا۔

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"مسٹر انور۔۔۔!"

"گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اُٹھتا ہوا بولا۔ "بعض اوقات میں لوگوں کو مصلحتاً غصّہ دِلا دیتا ہوں۔"

سونا گھاٹ سے واپسی پر انور کے ذہن میں عجیب قسم کا انتشار برپا تھا اور اس انتشار میں کئی تصویریں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ رابعہ، گلوریا، نکولس، سیکریٹری، سر صغیر احمد۔ وہ اُلجھتا رہا اور پھر شہر پہنچ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل

سر صغیر احمد کی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔ کوٹھی کے قریب اُسے سر صغیر دکھائی دیا جو اپنی کار پر کہیں جا رہا تھا۔ انور نے موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کر دی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ صغیر کی کار کافی دور نکل گئی تو اس نے اپنی موٹر سائیکل کوٹھی کے پھاٹک پر کھڑی کر دی اور خود اندر چلا گیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو۔۔۔!" ایک نوکر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "صاحب ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔"

"مس رابعہ۔۔۔!" انور نے اپنا ملاقاتی کارڈ نوکر کو دیتے ہوئے کہا۔

"نوکر چلا گیا اور انور بر آمدے میں انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد نوکر واپس آیا۔"

"مس صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ان سے کہہ دو بہت ضروری کام ہے۔" انور نے کہا اور پھر بُلند آواز میں بولا۔ "وہ کُنجیاں۔"

"مسٹر انور۔۔۔!" دروازے سے آواز آئی۔ "اندر آجایئے۔"

رابعہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

انور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"کُنجیاں واپس کر دیجیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیسی کُنجیاں؟"

"میں آپ سے اِلتجا کرتی ہوں۔" وہ رونی آواز میں بولی۔ "آپ جتنا روپیہ طلب کریں گے میں آپ کو دے سکتی ہوں۔"

"بھلا ایک ایسے آدمی کو روپوں پیسوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو پھانسی پر چڑھنے جارہا ہو۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

”پولیس کو وہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب پروفیسر کے قتل کا الزام بھی میرے ہی سر تھوپ دیا جائے گا۔“

”اوہ۔۔۔میرے خُدا میں کیا کروں۔“رابعہ سر پکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کُچھ نہیں۔۔۔میری پھانسی کی خبر اخبارات میں پڑھ لیجیے گا۔“

”نہیں۔۔۔نہیں۔“اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے۔

”تو پھر یہ بتایئے کہ پروفیسر کا قاتل کون ہے۔“

”میں۔۔۔میں کیا جانوں۔۔۔میں۔“

”کیا سر صغیر کو آپ کے اور پروفیسر کے سیکریٹری کی دوستی کے متعلّق معلوم ہے۔“

”جی۔۔۔!“وہ اچھل کر بولی۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا انہیں یہ معلوم تھا کہ آپ سیکریٹری کے ساتھ نشاط نگر

میں رات بسر کریں گی۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں سیکریٹری کو نہیں جانتی۔"

"تو پھر آپ نے اس کی کار چرائی ہو گی کیونکہ آپ اُسی کی کار پر مُجھ سے ملنے گئی تھیں۔"

"جی۔۔۔!" رابعہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"جی ہاں۔۔۔ میرے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے اور کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ وجے کمار کو آپ کب سے جانتی ہیں۔"

"میں کُچھ نہیں جانتی۔" وہ بے اختیار رو پڑی۔ "خُدا کے لیے کُنجیاں واپس کر دیجیے اور اپنا حق المحنت بتایئے۔"

"کیا اب میں حق المحنت اپنی قبر میں لے جاؤں گا۔"

"پھر میں کیا کروں۔"

”سب کُچھ سچ مچ بتا دیجیے۔“

”میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گی۔“

”کیا قاتل کا۔۔۔؟“

”نہیں نہیں۔۔۔ اس کا جس نے مُجھے پکھراج واپس کرنے لے لیے دیا تھا۔ لیکن وہ قاتل نہیں ہے۔ ہر گز نہیں۔“

”اچھّا تو پھر میں ہی قاتل ہوں۔۔۔ چڑھ جاؤں گا پھانسی پر۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔۔“ وہ بے تابانہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ کی یہ پریشانی مُجھے پھانسی سے نہیں بچا سکتی۔“

”میں کیا کروں۔۔۔!“ وہ پھر بیٹھ گئی۔

”سیکریٹری سچ مچ اس سازش میں شریک تھا یا آپ نے اُسے دھوکا دیا تھا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں میں کُچھ نہیں جانتی۔“

”آپ بہت کُچھ جانتی ہیں۔“

وہ پھر رو پڑی۔

”دیکھیے یہ سب بے کار ہے۔ آپ کے آنسو بھی مُجھے پھانسی سے نہیں بچا سکتے۔“

”مسٹر انور۔۔۔خُدا کے لیے۔“

”میں مجبور ہوں۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“

”آپ بتائیے کہ میں آپ کو کتنا روپیہ دوں۔“

”روپیہ میں آپ سے نہیں لوں گا۔“

”پھر۔۔۔!“

”میں نہیں بتا سکتا۔ لیجیے یہ کُنجیاں سنبھالیے۔“ انور کُنجیاں اس کی گود میں

پھینک کر کھڑا ہو گیا اور پھر جانے کے لیے مڑا۔

"مسٹر انور۔۔۔!"

"فرمایئے۔"

"خُدا کے لیے۔۔۔سنیے تو۔۔۔ایک منٹ ٹھہر جایئے۔۔۔ صرف ایک منٹ سنیے تو۔"

وہ پکارتی ہی رہ گئی۔انور کے قدموں کی آہٹیں دور ہوتی جارہی تھیں۔

پُراسرار گاہک

تقریباً دس بجے رات کو انور گھر واپس آرہا تھا کہ راستے میں آصف مل گیا وہ بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔

”خیریت۔“

”خیریت کیسی۔ یہ شہر ہی منحوس ہے۔“ آصف بیزاری سے بولا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“

”اما کوئی تُک ہے۔ نہ دِن چین۔ نہ رات چین۔ جب جیسی ہوا چل گئی اگر قتل

شروع ہوئے تو پھر قتل ہی قتل۔

"اب کون قتل ہوا۔"

"مے پول ہوٹل میں ایک مسافر وجے کمار۔" آصف نے کہا۔ انور نے بہت ضبط سے کام لیا تھا۔ اگر وہ اس وقت بہت زیادہ محتاط نہ ہوتا تو یقیناً اچھل پڑتا۔

"اچھّا۔۔۔!" اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ مدارس کا ایک مشہور بدمعاش تھا اور کئی بار کا سزا یافتہ بھی۔"

"مدارس کا۔۔۔!" انور نے کہا۔ "وہی تو نہیں جو کسی جوہری کے یہاں ڈاکہ ڈالنے کے سلسلے میں ماخوذ ہوا تھا۔"

"وہی۔۔۔وہی۔۔۔ لیکن میں تمہاری یادداشت کی داد دیتا ہوں۔"

"تو وہ کِن حالات میں قتل ہوا۔۔۔؟"

"ہوٹل والوں کا بیان ہے کہ شام کو جب وہ نشے میں بُری طرح دھت تھا ایک

آدمی اسے ہوٹل تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔ پھر ویٹروں نے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ تقریباً آٹھ بجے ایک ویٹر اس کا کھانا لے کر اس کے کمرے میں گیا اور وہاں سے اُلٹے پیر واپس آیا۔ اُس نے وہاں اس کی لاش دیکھی تھی ایک خنجر اس کے سینے میں پیوست تھا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اسے نشے ہی کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔"

"اس آدمی کا پتہ لگاؤ جو اُسے ہوٹل تک پہنچانے آیا تھا۔۔۔؟" انور نے پوچھا۔

"پتہ نہ لگتا تو اچھّا تھا۔۔۔!" آصف بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔۔۔!"

"یعنی۔۔۔!"

"سر صغیر احمد نے اسے ہوٹل پہنچایا تھا۔"

”اوہ۔۔۔تو کیا وہ سر صغیر کا دوست تھا۔“ انور نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔وہ اسے ایک جگہ نشے میں پڑا ہو ملا تھا۔“

”لیکن سر صغیر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مے پول ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”انہوں نے اس سے پہلے بھی اسے ہوٹل میں دیکھا تھا اس لیے وہ اسے ہوٹل لے آئے کہ شاید اسے کوئی پہچانتا ہو۔ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ وہ وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔“

”کیوں یقین کیوں نہ کرتا۔“ آصف بھنا کر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ انور نے کہا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

گھر پہنچ کر اسے رشیدہ کو سارے واقعات کی مکمّل رپورٹ دینی پڑی۔

”اب آرہے ہیں دانتوں پسینے۔“ رشیدہ مُسکرا کر بولی۔ ”پہلے ہی منع کیا تھا۔“

”تو کیا تُم یہ سمجھتی ہو کہ میں ہمّت ہار گیا۔“

”نہیں تم ٹھہرے تیس اور تیس ساٹھ مار خاں۔“

”ہشت۔۔۔ فضول بکواس نہیں۔ سنو کل تمہیں قدیر کے دفتر میں جا کر پوسٹ مارٹم کے پچھلے دو تین سال کے شمارے دیکھنے ہیں۔ مُجھے خیال پڑتا ہے کہ کبھی وہ پروفیسر تیموری اور سر صغیر احمد کے پیچھے پڑ گیا تھا ممکن ہے کہ کوئی کام کی بات ہاتھ لگ جائے۔“

”فضول اور بے کار۔“ رشیدہ اُکتا کر بولی۔ ”تم ہمیشہ نکمّی باتیں سوچتے ہو۔ خواہ مخواہ درد سری مول لینے سے کیا فائدہ۔“

”بہتر ہے میں یہ کام خود ہی انجام دے لوں گا۔“ انور بگڑ کر بولا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ تمہارے بغیر میں اپاہج ہو جاؤں گا۔“

”اچھّا بابا اچھّا۔ بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ضرور جھک ماروں گی۔“

انور کُچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔۔۔!" انور نے ریسیور اٹھالیا۔

"اوہ انور۔۔۔۔!" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ہوں قدیر۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سب کُچھ بتا دوں۔ یہ معاملہ سنگین ہے ممکن ہے کسی قانونی شکنجے میں پھنس جاؤں۔"

"تم مُجھے کیا بتاؤ گے۔" انور نے پوچھا۔

"یہی کہ پروفیسر کا سیکریٹری کل رات کو کہاں اور کس کے ساتھ تھا۔"

"مُجھے معلوم ہے۔" انور مسکرایا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولنے لگا۔

"تم کُچھ نہیں جانتے۔" دوسری طرف سے قہقہے کی آواز آئی۔

"میں پوچھتا ہوں کہ تم کس طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔"

دوسری طرف سے پھر قہقہہ سُنائی دیا۔ "دیکھو انور تم میرے احسان سے کسی

طرح نہیں بچ سکتے۔ اس قسم کی گفتگو کرنے کے بعد اور مُجھ سے معلومات حاصل کر کے تم کہہ دو گے کہ مُجھے اس کا پہلے سے علم تھا۔"

"یہ بات نہیں پیارے۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں رابعہ اور سیکریٹری کے عشق کے متعلّق ایک مثنوی لکھ رہا ہوں اور اس کے جملہ حقوق تمہارے نام محفوظ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"اوہ تو تمہیں سچ مچ معلوم ہے۔" قدیر جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے ان کا تعاقب کیوں کیا تھا۔"

"اب اسے پوچھ کر کیا کرو گے؟ اسی کی روٹیاں کھاتا ہوں۔ اگر پروفیسر کا قتل نہ ہو جاتا تو البتّہ ایک معقول رقم ہاتھ آنے کی اُمّید تھی۔ سر صغیر کبھی یہ نہ چاہتا کہ اس کی لڑکی بدنام ہو جائے۔"

"سر صغیر۔۔۔" انور طنزیہ انداز میں بولا۔ "اسے شاید یہ نہیں معلوم کہ وقت اس کے لیے پھانسی کا پھندا تیّار کر رہا ہے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا۔۔۔ وہ یعنی وہ۔۔۔!"

"ہاں مُجھے اس پر شُبہ ہے اور بہت جلد پولیس بھی میرے ہی راستے پر آ جائے گی۔"

"نہیں بھئی۔۔۔ تم آخر اس پر کیوں شُبہ کر رہے ہو۔ اگر نکولس ہی ہو اتو؟"

"لیکن اسے اپنے ہی تک محدود رکھنا کہ میں اس پر شُبہ کر رہا ہوں۔"

"ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ممکن ہے کل میں رشیدہ کو کسی کام سے تمہارے پاس بھیجوں۔"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ بڑی خُوشی سے۔"

"اچھّا شب بخیر۔۔۔!" انور نے ریسیور رکھ دیا اور رشیدہ کی طرف مُڑ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"وجے کمار وہی تھا۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"کون۔۔۔!"

"جس نے مدراسی جوہری کے یہاں ڈاکا ڈالا تھا اور انتہائی کوششوں کے باوجود بھی سیاہ پکھراج اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوا تھا۔"

"سیاہ پکھراج۔۔۔!" رشیدہ متحیّر ہو کر بولی۔ "آخر تمہارے سر پر سیاہ پکھراج کیوں سوار ہے۔"

انور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کوٹ اتارنے ہی جارہا تھا کہ رشیدہ پھر بولی۔

"کیا کھانا کھانے کا ارادہ نہیں۔"

"نہیں۔۔۔!" انور نے کہا اور کپڑے اُتارنے لگا۔ "میں نے تم سے سو بار کہہ دیا کہ کھانے کے لیے میرا انتظار نہ کیا کرو۔"

"بہتر ہے۔" رشیدہ جھلّا کر بولی اور کمرے سے چلی گئی۔

دوسرے دِن صُبح ہی صُبح پھر انسپکٹر آصف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انور کا ارادہ تھا کہ وہ

سب سے پہلے اپنے اخبار کے لیے جاسوسی ناول کی قسط لکھے گا پھر کسی دوسرے کام میں ہاتھ لگائے گا۔ لیکن سو کر اٹھنے کے بعد اسے آصف کا منہ دیکھنا پڑا۔ جو خلاف معمول بہت زیادہ رونق معلوم ہو رہا تھا۔

"دیکھا تم نے۔۔۔؟" وہ چہک کر بولا۔ "اس بار تم پھسڈی ہو گئے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"قاتل پکڑ لیا گیا۔"

"کون؟"

"نکولس۔"

"یہ تو بہت پرانی بات ہو چکی لیکن ثبوت کیا دو گے؟"

"پروفیسر کے قانونی مشیر سے معلوم ہوا کہ نکولس پروفیسر کا قرض دار تھا۔ پندرہ روز قبل پروفیسر نے اسے نوٹس دیا تھا کہ اگر وہ ایک ماہ کے اندر اندر اس کے

دس ہزار روپے ادانہ کر دے گا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”کیوں؟“ آصف مُسکرا کر بولا۔ ”کیا تمہیں یاد نہیں کہ جب تم تار جام پُہنچے تھے نکولس اور پروفیسر کسی بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔“

”یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ جھگڑا قتل ہی پر ختم ہوتا۔“ انور نے کہا اور آصف ہنسنے لگا۔

”خیر۔۔۔ کیا یہ ثبوت بھی ناکافی ہے کہ وہ ہتھوڑا جس سے پروفیسر قتل کیا گیا نکولس ہی کا تھا۔“

”یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔“

”نکولس کے ایک دوست ریٹائرڈ حوالدار میجر شمشیر سنگھ نے اسے شناخت کیا ہے۔“

"اوہ۔۔۔ وہ پگلا حوالدار میجر۔۔۔!" انور قہقہہ لگا کر بولا۔ "یقیناً اپنی عقل کے بجائے تم خود کہیں چرنے گئے تھے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"بھلا اس پاگل کی شہادت کس عدالت میں پیش کروگے۔"

آصف نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور انور اسے گھورنے لگا۔

"خیر۔۔۔ خیر۔۔۔ تم بہت زیادہ عقل مند نہیں ہو۔ خود نکولس نے اس بات کا اعتراف کیاہے کہ وہ ہتھوڑا اسی کا ہے۔" آصف مُسکرا کر بولا۔

"نکولس نے۔۔۔!"

"ہاں ہاں نکولس نے اور اس سے یہ بھی اگلوا لیا جائے گا کہ وہ پروفیسر کا قاتل ہے۔"

"اچھّا تو کیا اسے اس سے انکار ہے۔"

"ہاں۔۔۔ وہ اس کا اعتراف تو کرتا ہے کہ ہتھوڑا اسی کا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ پروفیسر کے گھر میں پہنچا کیسے۔"

اس بار انور نے ایک چھت شگاف قہقہہ لگایا اور آصف کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"آصف میاں تم ابھی بُوڑھے ہو۔ اگر وہ سچ مچ پروفیسر کا قاتل ہوتا تو کبھی اس بات کا اعتراف نہ کرتا کہ وہ اسی کا ہتھوڑا ہے۔"

"مگر حوالدار میجر۔۔۔!"

"وہ مخبوط الحواس ہے۔ اس لیے اس کی شہادت قانون کی نگاہ میں بے مصرف ہے۔"

"خیر میں تمہیں دکھادوں گا۔" آصف جھلّا کر بولا۔

"مگر مُفت دکھانا کیونکہ میں تمہارا پرانا دوست ہوں۔"

آصف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور انور کو گھورے جا رہا تھا۔

"خیر ہٹاؤ۔۔۔!" انور تھوڑی دیر بعد بولا۔ "پروفیسر کے کسی وارث کا پتہ چلا۔"

"ہاں اس کا ایک بھائی سرحدی علاقے میں سمور کی تجارت کرتا ہے۔ پروفیسر کے قانونی مشیر نے اسے اِطّلاع دی تھی۔ اس پر اس نے اسے بذریعہ تار ہدایت کی کہ پروفیسر کا سارا اثاثہ بیچ ڈالا جائے اور دوسری دلچسپ بات یہ کہ ایک آدمی پروفیسر کی خواب گاہ کا سارا سامان خریدنے پر مجبور ہو گیا ہے۔"

"صرف خواب گاہ کا سامان۔" انور چونک کر بولا۔ "وہ آدمی کون ہے؟"

"اس نے مسٹر داس سے فون پر بات چیت کی تھی۔ غالباً وہ کسی بینک کے ذریعے یہ سودا طے کرے گا۔"

"اس نے اپنا نام بتایا ہی ہو گا۔" انور نے کہا۔

"ہاں۔۔۔جے پی سنگھ۔۔۔!"

"لیکن کس بینک کے ذریعہ۔"

"ابھی یہ کُچھ نہیں معلوم ہو سکا۔"

انور نے نوٹ بک اُٹھا کر اس میں آصف کا بتایا ہوا نام لکھ لیا۔ اس کے ذہن میں تجوری ناچ رہی تھی جس میں سیاہ پکھراج رکھا جاتا تھا اور وہ تجوری پروفیسر کی خواب گاہ میں رکھی ہوئی تھی۔

"یہ بتاؤ کہ وہ صرف خواب گاہ ہی کا سامان کیوں خریدنا چاہتا ہے۔" انور نے پوچھا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" آصف نے کہا۔

"کیا وہ تجوری خواب گاہ ہی میں نہیں ہے جس میں وہ سیاہ پکھراج رکھا ہوا ہے۔"

"اگر یہی بات ہے تو اُس احمق خریدار کو بعد میں بڑی مایوسی ہو گئی۔" آصف ہنس کر بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"سیکریٹری نے اس پتھّر کو بینک میں رکھوادیا ہے۔"

"اچھّا! کس بینک میں؟"

"نیشنل بینک۔۔۔!"

"اوہ۔۔۔!" انور اچھل کر بولا۔ "اور سر صغیر اس بینک کا ڈائریکٹر ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سر صغیر ہی پروفیسر کا قاتل ہے۔"

"یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" آصف منہ بنا کر بولا۔

"خیر دیکھا جائے گا۔"

"آخر تم سر صغیر کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔" آصف نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اور میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تم کسی سیاہ پتھّر کا تذکرہ بار بار کرتے رہے ہو۔"

"صرف یہی نہیں۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "میں یہ بھی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وجے کمار کا قتل بھی اسی سِلسِلے کی ایک کڑی ہے۔"

"شاباش۔۔۔!" آصف نے قہقہہ لگایا۔ "بس بس اب صرف افیون کی ایک گولی اور پاؤ بھر دودھ کی اور ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد تم اپنے اُستاد کے بھی کان کاٹ لوگے۔"

انور نے کوئی جواب دینے کے بجائے تولیہ کاندھے پر ڈالا اور غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ آصف تھوڑی دیر تک بیٹھا کُچھ سوچتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر چلا گیا۔

ناشتہ کرتے وقت انور رشیدہ سے کہہ رہا تھا۔

"آج تم آفس نہیں جاؤ گی۔ تمہیں روزنامہ 'پوسٹ مارٹم' کے پرانے فائل اُلٹنے ہیں اور ہاں ایک اور نئی دریافت۔۔۔ تم یہاں کے سارے بینکوں میں گھوم پھر کر

یہ پتہ لگاؤ کہ کسی نے جے بی سنگھ کے نام سے اس دوران میں کوئی رقم تو نہیں جمع کرائی اور جمع کروائی ہے تو کس نے۔"

"فائل تو میں دیکھ لوں گی مگر یہ دوسرا کام میرے بس کا نہیں۔ کہاں کہاں کی خاک چھانتی پھروں گی۔"

"قدیر کو ساتھ لے لینا۔ میں اس سے فون پر کہہ دوں گا۔"

"بھئی۔۔۔ یہ قدیر۔۔۔!" رشیدہ منہ بنا کر بولی۔ "بہت بور ہے۔۔۔ خواہ مخواہ بھیجا چاٹ ڈالتا ہے۔"

"بہر حال آج تو تمہیں اُسے برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

"لیکن یہ جے بی سنگھ کون ہے اور کہاں سے ٹپک پڑا۔" رشیدہ نے پوچھا اور انور نے پورا واقعہ دہرا دیا۔

"جب نکولس نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہتھوڑا اسی کا ہے تو پھر اب خواہ مخواہ بھاگ دوڑ کی کیا ضرورت ہے۔" رشیدہ بولی۔

”یہ ایک اچھّا خاصہ معمّہ ہے۔“ انور سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ ”اور اب گلوریا کو بولنا ہی پڑے گا۔ وہ کوئی اہم بات جانتی ہے جسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مُجھے یقین ہے کہ نکولس پروفیسر کا قاتل نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا وہ کبھی اسے اپنا ہتھوڑا نہ تسلیم کرتا۔“

جنگ اور خاتمہ

دوسری صُبح انور کو حد درجہ خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی پچھلی تازگی دوبارہ لوٹ آئی تھی اور اس کے چہرے پر فکر کے بادل نہیں تھے۔ پچھلی رات کو رشیدہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی اور وہ تقریباً دو بجے رات کو چوروں کی طرح اپنے کمرے میں داخل ہو کر چُپ چاپ سو گیا تھا۔ صُبح چھ بجے آنکھ کھل جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک بستر میں پڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔

ذہن اور جسم دونوں تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ صُبح اس کے لیے بے حد خوشگوار تھی۔

”بیٹے آصف۔۔۔!“ وہ خود بخود بڑبڑایا۔ ”اس بار تمہیں مُرغا بنا کر چھوڑوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انور نے بُرا سا منہ بنایا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

رشیدہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک کر انور کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر کُچھ اور قریب آ کر اس طرح نتھنے سکوڑے جیسے کُچھ سُونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”اوہ۔۔۔!“ انور بھی اسی انداز میں بولا۔

”تم تو کبھی کوئی خوشبو نہیں استعمال کرتے تھے۔“ رشیدہ منہ سکوڑ کر بولی۔

”میں اب بھی کوئی خوشبو نہیں استعمال کرتا۔“

”تو پھر یہ تمہارے پاس سے ایوننگ ان پیرس کی بھینی بھینی خوشبو کیسے آ رہی ہے۔“

انور نے اب غور کیا کہ وہ پچھلی رات کی پتلون اور قمیض ہی پہنے ہوئے سو گیا تھا۔

"اور یہ تمہارے کاندھے پر سُرخ دھبّہ کیسا۔۔۔!" رشیدہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ "اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ لپ اسٹک کا دھبّہ ہے۔"

"ارے۔۔۔ یہ۔۔۔ ہاں ہے تو۔ لیکن یہ لپ اسٹک کے دھبّے کا میرے پاس کیا کام۔"

"اب مُجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔"

"بھلا میں تمہیں بے وقوف کیوں بنانے لگا۔"

"کل رات کو تم کہاں تھے۔" رشیدہ گرج کر بولی۔

"اخّاہ۔۔۔ اب تم نے بھی انسپکٹر آصف کی طرح اس قسم کے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔"

"میں پوچھتی ہوں تم کہاں تھے؟"

”میں بتاتا ہوں کہ نہیں بتاؤں گا۔“ انور جھلّا کر بولا۔ ”میں نے تُم سے کبھی اس قسم کے سوالات نہیں کیے۔“

”میں تمہاری طرح آوارہ تو نہیں کہ تمہیں اس کا موقع ملتا۔“

”اچھّا بس بس۔۔۔!“ انور بگڑ کر بولا۔ ”تم ہمیشہ یہ بھول جاتی ہو کہ ہم دونوں صرف دوست ہیں۔“

”میں ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔۔۔ لیکن تم آوارگی نہیں کر سکتے۔“

”آوارگی۔۔۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا کیا۔“

”تو کیا پھر یہ لپ اسٹک کا دھبّہ آسمان سے اترا ہے۔“

”چلو چلو۔۔۔ اپنا کام کرو۔“

”تمہیں بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟“ رشیدہ جھنجھلا کر بولی۔

”کون۔۔۔؟“

"میں کہتی ہوں کہ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"مجھے اس سے انکار کب ہے۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "نہ جانے کیوں وہ اس وقت لڑنا نہیں چاہتا تھا۔"

"دیکھو تمہیں بتانا پڑے گا۔"

"اچھّا تو سنو! کل رات میں گلوریا سے ملا تھا اور اسے سیدھی راہ پر لانے کے لیے مجھے اسے شراب بھی پلانی پڑی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد نشے میں مجھ پر آ گری۔"

رشیدہ کچھ سوچنے لگی لیکن انور پھر بولا۔

"اب تمہارا دماغ صاف ہوا یا نہیں۔"

"گلوریا سے تمہیں کیا معلوم ہوا۔" رشیدہ نے پوچھا۔

"میں نے اُسے راز رکھنے کی قسم کھالی ہے اس لیے مجبور نہ کرو لیکن اتنا ضرور بتا

سکتا ہوں کہ یہ دونوں قتل اس پتھّر کے سِلسِلے میں نہیں ہوئے۔"

"پھر۔۔۔!"

"پہلے تم مُجھے اپنے کل کے کاموں کی رپورٹ دو۔۔۔!"

"وجے کمار کے متعلّق کُچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ مگر ۱۹۵۰ کے فائل میں مُجھے ایک دلچسپ بات نظر آئی تھی۔"

"وہ کیا۔۔۔!"

"قدیر اس زمانے میں پروفیسر تیموری کے خلاف لکھ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ بیس شماروں میں اس نے اس کے خلاف لکھا ہے اور پھر اچانک لکھنا بند کر دیا اور پھر ایسی صورت میں جبکہ ایک دِن قبل اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ دوسرے شمارے میں کُچھ اور دلچسپ باتیں لکھنے کی کوشش کرے گا لیکن اس نے دوسرے شمارے میں پروفیسر کے متعلّق کُچھ نہیں لکھا۔ بلکہ تب سے اب تک اس کا نام تک نہیں لیا اور اسی آخری شمارے میں ایک خبر بھی دیکھی جس میں یہ تھا کہ سونا گھاٹ پر

تیموری منزل کے قریب کسی نامعلوم آدمی کی موٹر کے نیچے ایک بُڑھیا دب کر مر گئی۔ مجرم کی تلاش جاری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”بہت اچھّے۔۔۔!“ انور چیخ کر بولا۔ ”بھلا وہ کس تاریخ کا شمارہ تھا۔“

”۱۳ جون ۵۰ء کا۔“

”پھر بہت اچھّے۔۔۔ رشّو تم نے کمال کر دیا۔“ انور نے اسے جھنجھوڑ کر کہا اور رشیدہ حیرت سے اس کا مُنہ دیکھنے لگی، وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”اچھّا بینک کا کیا رہا۔“

”سارے بینک دیکھ ڈالے لیکن کُچھ پتہ نہیں چلا۔“ رشیدہ نے کہا۔

”قدیر دِن بھر میرے ساتھ مارا مارا پھرا اور اچانک اس کے پیٹ میں بڑا شدید درد اٹھا جس کی بناء پر میں نے اسے واپس کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی تلاشی بے سود ہے۔“

"کوئی بینک چھوٹا تو نہیں۔"

"چائنا بینک۔۔۔ میرا خیال ہے کہ وہی باقی بچا تھا۔ قدیر نے کہا کہ وہاں جانا فضول ہے کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر مُلکی سرمایہ رہتا ہے لیکن میں اسے واپس کرنے کے بعد وہاں بھی گئی تھی اور اب تم اچھل پڑو کیونکہ وہاں جے بی سنگھ کے نام پانچ ہزار روپے منتقل کیے گئے ہیں۔"

"کس نے منتقل کیا ہے۔" انور نے بے تابی سے پوچھا۔

"مسٹر قدیر احمد ایڈیٹر روزنامہ پوسٹ مارٹم۔۔۔!"

"وہ مارا۔۔۔!" انور اچھل کر بولا۔ "بنایا آصف کو مُرغا۔"

"لیکن یہ معاملہ کیا ہے۔"

"بہت بڑا معاملہ رشّو۔ یہ تو ایک دلچسپ اتّفاق ہے۔ ورنہ میں بُدّھو بن گیا تھا۔" انور نے کہا اور فون کی طرف لپکا۔

"ہیلو۔۔۔!" وہ ریسیور کان کے قریب لے جا کر رشیدہ کو آنکھ مار کر بولا۔

"ہیلو۔۔۔ کیا قدیر صاحب ہیں۔۔۔ اوہ۔۔۔ اچھّا۔" وہ ریسیور رکھ کر رشیدہ کی طرف مڑا۔

"میں نے قدیر کے آفس میں فون کیا تھا۔ وہ گھر پر موجود ہے جلدی سے تیّار ہو جاؤ۔ ہم لوگ وہیں چائے پئیں گے۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"جاؤ جلدی جاؤ۔" وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔ "بات پھر بتاؤں گا۔"

رشیدہ چلی گئی اور انور دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میز کی دراز سے ایک پستول نکالا اور اسے چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد پھر دراز میں بند کر دیا اور اب ایک چمک دار چاقو اس کی مُٹھّی میں دبا ہوا تھا۔

رشیدہ کپڑے تبدیل کر کے آگئی تھی۔ انور نے قدِ آدم آئینے پر الوداعی نظر ڈالی اور چلنے کے لیے تیّار ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں موٹر سائیکل پر قدیر کے بنگلے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ٹیلی فون پوسٹ کے قریب انور نے موٹر سائیکل روک دی۔

"کیوں کیا بات ہے۔" رشیدہ نے پوچھا۔

"آصف کو فون کروں گا۔"

"گھر ہی سے کر لیا ہوتا۔"

"خیال نہیں آیا تھا۔۔۔ یہ ضروری ہے۔"

"فون کرنے کے بعد وہ پھر چل پڑے اور بقیہ راستہ جلد ہی طے ہو گیا۔ وہ پورٹیکو میں تھے کہ قدیر باہر نکلا۔ شاید وہ کہیں باہر جانے کے لیے تیّار تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکا رکھا تھا۔"

"ہیلو۔۔۔انور۔۔۔رشیدہ۔" وہ انہیں دیکھ کر چہکا۔ "اِدھر کیسے بھول پڑے۔ آؤ بھئی آؤ۔ میں نے اپنا جانا ملتوی کر دیا۔"

"کہیں باہر جا رہے تھے۔" انور سوٹ کیس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اس میں کُچھ کاغذات ہیں۔ آؤ آؤ۔۔۔ چلو اندر چلو۔"

"ہم لوگوں نے ابھی چائے نہیں پی۔ میں دراصل تمہاری خیریت پوچھنے کے لیے آیا تھا۔ رشیدہ سے معلوم ہوا کہ کل تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ بھئی کل کی تکلیف کا بہت بہت شکریہ۔"

"دوستوں کے لیے میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیّار رہتا ہوں۔" قدیر مُسکرا کر بولا۔ "میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں۔ نہ جانے کب سے تم سے کہہ رہا ہوں کہ ایک جاسوسی ناول میرے اخبار کے لیے بھی لکھ دو مگر تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"مُجھے شرمندگی ہے۔" انور افسوس ظاہر کرتا ہوا بولا۔ "میں ضرور لکھوں گا۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

"اچھّا بھئی تم لوگوں کے لیے چائے بناؤں۔" قدیر اٹھتا ہوا بولا۔

"کیوں تم کیوں بناؤ گے۔" انور نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ میں اتوار کو سب نوکروں کو چھٹی دیتا ہوں اور اس دِن اپنا سارا کام خود ہی کرتا ہوں۔"

"بہت اچھّا اصول ہے۔" انور نے کہا۔

"تو رہنے دیجیے۔" رشیدہ بولی۔ "خواہ مخواہ تکلیف کرنے سے کیا فائدہ۔"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ صرف پانچ منٹ لگیں گے۔ میں ابھی آیا۔" قدیر نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

"تو میں بھی چلتی ہوں آپ کی مدد کرا لوں گی۔"

"نہیں نہیں آپ بیٹھیے۔" انور آہستہ سے بولا۔

درمیانی وقفے میں بالکل خاموشی رہی۔ رشیدہ کسی اُلجھن میں مبتلا تھی۔ وہ کبھی کبھی انور کی طرف سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد قدیر ٹرے میں چائے کا سامان لے کر آگیا۔

"چائے تو لذیذ ہے۔" رشیدہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔ "انور نہایت بے دردی سے پیسٹریوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔"

"بہت لذیذ۔۔۔!" وہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ "اس وقت مُجھے ۱۳ جون ۵۰ء کی حسین شام یاد آرہی ہے۔"

قدیر نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ انور کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابھی اور بھی بہت کُچھ یاد آئے گا۔"

"برسبیلِ تذکرہ۔۔۔!" انور نے کہا۔ "کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم نے اس رات کو رابعہ اور سیکریٹری کا تعاقب کیوں کیا تھا۔"

”تاکہ تُم جیسے حرام خوروں کا پیٹ بھرا جا سکے۔“ قدیر گرج کر بولا۔ اچانک اس کا چہرہ بہت زیادہ خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ انور کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی رگوں کا خون منجمد ہو گیا ہو۔ جسم میں عجیب قسم کی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا لیکن توازن بر قرار نہ رکھ سکا۔ قدیر کے قہقہے کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ رشیدہ بھی صوفے پر ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ اسے اس کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ اسے کب ہوش آیا لیکن اس کا سویا سویا ذہن محسوس کر رہا تھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہے اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف تنے ہوئے ہیں۔ کلائیوں میں تیز قسم کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں کھڑا ہے اور اس کے دونوں ہاتھ لوہے کی دو موٹی سلاخوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر رشیدہ اسی حالت میں کھڑی تھی لیکن ابھی اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ ان سلاخوں

کے درمیان جھول سی گئی تھی۔ انور نے سلاخوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً دو فٹ رہا ہو گا اور ان کی اونچائی اتنی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ تنے ہوئے تھے۔ کُچھ دیر بعد اسے رشیدہ کی چیخ سُنائی دی۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی اور انور کو گھور رہی تھی۔ دفعتاً کوٹھڑی کے باہر قدموں کی آہٹ سُنائی دی اور قدیر ان کے درمیان آکر کھڑا ہو گیا۔

"کیوں بیٹے انور صاحب۔ بڑے عقل مند بنتے تھے۔" قدیر گرج کر بولا۔ "وہ پرچہ کہاں ہے۔"

"کون سا پرچہ۔۔۔!" انور غُصّے کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ "میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتا۔"

"اچھّا۔۔۔ اب مُجھے سبق پڑھانے چلے ہو۔ میں تم دونوں کی قبر کھود کر یہیں دفن کر دوں گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی۔"

"معلوم نہیں تم کیا بک رہے ہو۔" انور گرج کر بولا۔

”یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم نے ابھی اُسے پولیس کے حوالے نہ کیا ہو گا۔“ قدیر اس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے بولا۔ ”کیونکہ تم پولیس کو اچانک متحیّر کر دینے کے عادی ہو گئے ہو۔ دیکھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ پرچہ میرے حوالے کر دو اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔ مُجھے بتاؤ کہ تم نے اسے کہاں رکھا ہے میں خود تلاش کر لوں گا۔ ورنہ دوسری صورت میں تم جانتے ہی ہو کہ ایک قتل کو چھپانے کے لیے اکثر کئی قتل کرنے پڑتے ہیں۔ وجے کمار کا قتل شاید تمہیں یاد ہو۔“

”مُجھے سب کُچھ یاد ہے۔“ انور بیزاری سے بولا۔ ”لیکن یہ پرچہ ورچہ کیا ہے میں کُچھ نہیں جانتا۔“

”بیٹے انور تم مُجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ کل رات کو جب تم پروفیسر کی خواب گاہ کی تلاشی لے رہے تھے میں بھی اس کے مکان میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے بعد میں تمہارا تعاقب کیا تھا وہ میں ہی تھا۔ تم شاید مُجھے پولیس کا سپاہی سمجھے تھے اور اس کے علاوہ سمجھتے بھی تو کیا۔ میں باقاعدہ پولیس کی وردی میں تھا۔

شاباش بتادو جلدی سے کہ وہ پرچہ کہاں ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

انور تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

"اس پرچے کی قیمت دس ہزار روپے ہے۔"

"ٹھٹھیرے ٹھٹھیرے بدلائی نہیں ہوتی فرزند۔" قدیر مُسکرا کر بولا۔ "تم مُجھ سے دس پیسے بھی وصول نہیں کر سکتے۔ اگر تمہیں زندگی عزیز ہو گی تو آپ بتاؤ گے۔"

"لیکن شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میں انسپکٹر آصف کو فون کر کے یہاں آیا ہوں۔" انور بولا۔

"اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے بچّوں کی طرح بہلا سکتا ہوں۔" قدیر نے کہا۔

"فی الحال میں جا رہا ہوں۔ اسے اچھّی طرح سمجھ لو اور تم رشیدہ اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ مُفت میں اپنی اور تمہاری جان گنوائے گا۔"

قدیر چلا گیا۔

”آخر یہ سب کیا ہے۔“ رشیدہ خوفزدہ آواز میں بولی۔

”یہ ایک وقتی تفریح ہے۔“ انور ہنس کر بولا۔ ”مُجھے قتل کرنے کے لیے قیامت کے قریب دجال کا ظہور ہو گا۔ اس سے پہلے تو مرتا نہیں۔“

”لیکن وہ پرچہ کیسا ہے جس کا تذکرہ تم نے مُجھ سے بھی نہیں کیا۔“

”قدیر نے اُسی پرچے کے لیے پروفیسر کو قتل کیا تھا۔“

”اور وہ سیاہ پتھّر۔۔۔!“

”وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کا تعلّق پروفیسر کے قتل سے نہیں۔ میں ابھی تک اسے کسی جاسوسی ناول کا خونی ہیرا سمجھتا رہا تھا لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔“

”لیکن اس مُصیبت سے کس طرح چھٹکارا ہو گا۔“ رشیدہ کراہ کر بولی۔

”چھٹکارا۔۔۔!“ انور نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ فی الحال خود اسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چھٹکارے کی کیا صورت ہو گی۔“

”تم نے کس مُصیبت میں پھنسا دیا۔ اگر تم مُجھے پہلے ہی بتا دیتے تو میں تمہیں یہاں اس طرح ہر گز نہ آنے دیتی۔“

”اور اگر آدم شجرِ ممنوعہ کے قریب نہ جاتے تو اس خرابے میں کیوں پھنستے۔ میں تمہیں مرد نہیں بنا سکتا ہمیشہ عورت ہی رہو گی۔“ انور منہ بنا کر بولا۔ ”بس غَلَطی ہو گئی! مُجھے کیا معلوم تھا کہ کل اسی نے میرا تعاقب کیا تھا۔“

”لیکن یہ سب ہے کیا۔“

”بہت بڑا واقعہ۔۔۔ انتہائی پیچیدہ۔ اگر قدیر سے جے بی سنگھ والی حماقت نہ ہو جاتی تو دُنیا کا کوئی سُراغ رساں مجرم کا پتہ نہ لگا سکتا۔“

”تو کیا اس نے یہ سب تمہیں پھنسانے کے لیے کیا تھا۔“

”نہیں قطعی نہیں! کہہ دیا کہ پتھّر والا واقعہ اس قتل سے کوئی تعلّق نہیں رکھتا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ قدیر اس دِن صُبح غیر متوقّع طور پر ہمارے یہاں پہنچا تھا اسے کسی طرح علم ہو گیا ہو گا کہ اس سِلسِلے میں آصف کو مُجھ پر بھی شُبہ ہے اسی لیے وہ

سیکریٹری اور رابعہ کی کہانی لے کر پہنچا تھا۔ لیکن اس نے صاف صاف نہیں بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہ ضرور معلوم کر لوں گا کہ سیکریٹری اس رات کو کہاں اور کس کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے پھر مُجھے یہ کہہ کر مطلع کر دیا کہ وہ اس معاملے میں پیسے نہیں بنانا چاہتا۔ وہ ان دونوں کو نشاط نگر جاتے دیکھ کر ان کے پیچھے لگ گیا تھا اور شاید ان کی گفتگو بھی سُن لی تھی کہ وہ رات وہیں گذاریں گے۔ اس نے سوچا کہ پروفیسر اس وقت تنہا ہی ہو گا۔ اس لیے وہ خلاف توقّع رات ہی کو تار جام سے واپس آ گیا تھا۔"

"لیکن آخر اس نے پروفیسر کو قتل کیوں کیا۔" رشیدہ بولی۔

"وہی بلیک میلنگ کا چکّر تھا۔ تُم نے اس اخبار کے فائل تو دیکھے ہی ہیں تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ پروفیسر کے خلاف لکھ لکھ کر اس سے روپیہ اینٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن شاید پروفیسر نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ تیرہ جون ۵۰ء کے شمار میں قدیر نے اُسے اس کا کوئی راز افشا کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس پر پروفیسر نے اسے معاملات طے کرنے کے لیے سونا گھاٹ بُلایا تھا۔

وہاں اتّفاق سے ایک بُڑھیا اس کی کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئی۔

پروفیسر نے دیکھ لیا اور اسے دھمکی دی کہ وہ پولیس کو اس کی اِطّلاع دے دے گا۔ قدیر ڈر گیا تھا۔ اس سے روپیہ اینٹھنے تھے اور خود مُصیبت میں پھنس گیا؟ آخر کار ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ پروفیسر نے اُس سے بُڑھیا کو کار کے نیچے کچل دینے کا اقرار نامہ لکھوا لیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر وہ کبھی اسے یا اس کے کسی دوست کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس اقرار نامے کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس نے اقرار نامہ نہایت احتیاط سے اپنی خواب گاہ کی ایک کُرسی کے گدّے میں سی رکھا تھا۔ قدیر نے اُسی اقرار نامے کے لیے اسے قتل کیا تھا۔ ہو سکتا ہے بعد کو پروفیسر نے بھی اس سے روپیہ اینٹھنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال وہ قتل کی رات کو اقرار نامہ نہ پا سکا لیکن شاید یہ جانتا تھا کہ وہ خواب گاہ ہی میں کہیں محفوظ ہے۔ لہٰذا اس نے جی بی سنگھ کے فرضی نام سے خواب گاہ کا سامان خریدنے کی پیشکش کی اور پھر جب تم اس کے پاس اس لیے پہنچیں کہ وہ تمھیں جے بی سنگھ کا پتہ لگانے میں مدد دے تو وہ بھڑک گیا اس نے یہ بھی

محسوس کیا کہ تم اس کے اخبار کے فائل خواہ مخواہ نہیں اُلٹ پلٹ رہی ہو۔ ہاں تو میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ رات کو پروفیسر کی خواب گاہ کی تلاشی ضرور لوں گا۔ اُدھر قدیر بھی اِسی تاک میں تھا۔ وہ ایک پولیس میں کی وردی پہنے ہوئے تھا جب میں وہ اقرار نامہ نکال کر وہاں سے نکلا تو اس نے میرا تعاقب کیا مگر میں اُسے پہچان نہیں پایا تھا ورنہ اس وقت مُجھ سے یہ حماقت نہ ہوتی۔"

"اور وہ پتھّر والا معاملہ۔۔۔!"

"مُجھے افسوس ہے کہ میں اس کے متعلّق کُچھ نہ بتا سکوں گا۔ میں نے گلوریا سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"گلوریا سے؟"

"ہاں۔۔۔ اُسے بھول جاؤ۔"

"تو کیا تُم یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ بچ جائیں گے۔"

"کیوں نہیں۔۔۔ جب تک کہ میری شہ رگ نہ کٹ جائے میں یہی سوچتا رہوں

گا کہ میں مر نہیں سکتا۔ میں نے آصف کو فون کر دیا تھا کہ میں قدیر کے یہاں جا رہا ہوں۔ قاتل وہی ہے اسے ثابت کر دوں گا۔"

"ممکن ہے وہ آ کر لوٹ بھی گیا ہو۔ قدیر نے اسے پٹّی پڑھا دی ہو خود اس کے پاس تو اس کا کوئی ثبوت ہے نہیں۔ تمہارے بیان کے مطابق اقرار نامہ تمہارے ہی پاس ہے۔"

"پھر بھی میں ہمّت نہیں ہار سکتا۔" انور نے کہا اور اپنے جوتے اُتارنے لگا پھر اس نے ایک پیر کا موزہ دوسرے پیر سے دبا کر اُتار دیا۔ بائیں پیر سے دائیں پیر کی موری اوپر سرکائی اور موزے میں اَڑا ہوا ایک بڑا سا چمک دار چاقو نکال کر فرش پر ڈال دیا۔ رشیدہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ انور نے داہنے پیر کا موزہ بھی اُتار دیا۔

"لیکن اسے استعمال کس طرح کرو گے۔۔۔ دونوں ہاتھ تو بندھے ہوئے ہیں۔" رشیدہ پر اُمّید لہجے میں بولی۔

”ڈارون کی تھیوری کے مطابق آدمی پہلے بندر تھا۔“ انور نے مُسکرا کر کہا۔ ”اور تم جانتی ہی ہو۔ بندر پیروں سے بھی ہاتھوں کا کام لے سکتے ہیں۔ دُنیا کے سب بندر آدمی ہو گئے مگر میں ابھی تک بندر ہوں اور اس وقت تمہیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ میں کسی حال میں بھی ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا۔ کئی سرکس والے اب تک یہ چاہتے ہیں کہ ان کے سرکس میں نوکری کر لوں۔“

انور نے چاقو کا دستہ داہنے پیر کے انگوٹھے اور انگلیوں سے دبایا اور لوہے کی چھڑوں کو مضبُوطی سے پکڑ کر بندروں کی طرح اُلٹ گیا۔ وہ داہنے ہاتھ کی رسّی کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا کلائی پر رسّی کا تناؤ بڑھ جانے کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہ رہ سکا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ رسّی کاٹنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ پھر سیدھا ہو گیا۔

سارے جسم سے پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑی تھیں اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے مُسکرا کر رشیدہ کی طرف دیکھا اور رشیدہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ انور کی کلائی پر بہتے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ شاید چاقو لگ گیا۔

”رشّو ڈارلنگ روتے نہیں۔“ انور نے کہا اور پھر چاقو کو انگلیوں میں دبا کر اُلٹ گیا۔ اس کی چڑھتی ہوئی سانسوں کے ساتھ رشیدہ کی سِسکیاں بھی کوٹھری میں گونج رہی تھیں۔

انور نے دوسرا ہاتھ بھی کھول ڈالا اور پھر رشیدہ بھی آزاد ہو گئی۔ وہ اس کے بازوؤں میں پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

”رشّو ڈارلنگ، چُپ رہو۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔

”میرا بندر۔۔۔ میرا بندر۔۔۔! مُجھ میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں۔ یہ دیکھو۔“ اُس نے اپنا داہنا ہاتھ سامنے کر دیا جس سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے لیکن وہ باہر سے بند تھا۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ لیکن وہ باہر سے بند تھا۔

”فکر مت کرو۔۔۔ کبھی تو کھُلے گا۔“ انور نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر

دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ رشیدہ اپنی ساری پھاڑ کر اس کے زخمی ہاتھ پر پٹّی باندھنے لگی۔

انور بڑی نقّاہت محسوس کر رہا تھا۔ ایک تو ابھی تک اس نشہ آور چائے کا اثر باقی تھا۔ دوسرے ہاتھ سے کافی خون نکل گیا تھا اور پھر اس جمناسٹک کی تھکن۔۔۔ دونوں گھنٹوں اسی طرح بیٹھے رہے۔

تقریباً تین بجے کوٹھری کے باہر قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ انور نے رشیدہ کو دروازے کے دوسرے طرف کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

کنڈی اُتارنے کی آواز آئی۔ دونوں پٹ کھل گئے۔ انور اور رشیدہ پٹوں کی آڑ میں تھے جیسے ہی قدیر اندر داخل ہوا انور اس پر ٹوٹ پڑا۔ رشیدہ الگ کھڑی تھی۔ انور نے اسے پہلے ہی حملے میں گِرا لیا تھا۔ قدیر بھی کمزور نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری طاقت صرف کر رہا تھا۔ دونوں گتھے ہوئے زمین پر لوٹ رہے تھے۔ رشیدہ کی

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دفعتاً قدیر انور کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ رشیدہ گھبرا گئی۔ دفعتاً اسے وہ چاقو یاد آ گیا جو انور وہیں کٹی ہوئی رسیوں میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ چاقو اٹھا کر دیوانہ وار قدیر پر ٹوٹ پڑی۔ وار گہرا نہیں تھا پھر بھی قدیر اُچھل کر پیچھے کی طرف آ گرا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا انور اس پر تھا۔

تھوڑی دیر بعد انور اور رشیدہ اسے رسیوں میں جکڑ رہے تھے۔

دوسری صُبح کے اخبارات اس حیرت انگیز گرفتاری پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ لیکن صحیح واقعہ صرف انور کے اخبار نے چھاپا تھا اور اس کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں۔

وہ دِن انسپکٹر آصف کے لیے یقیناً بڑا منحوس تھا۔ انور نے جی کھول کر اس کا مضحکہ اڑایا لیکن وہ سب کُچھ خاموشی سے سہتا رہا۔ اور کرتا بھی کیا۔ بُری طرح شکست کھا گیا تھا۔

رشیدہ نے انور کو کئی بار مجبور کیا کہ وہ اسے سیاہ پکھراج کا راز بتا دے مگر ناکام رہی۔

اسی شام کو انور سر صغیر کی کوٹھی کے پائیں باغ میں بیٹھا سر صغیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنا ملاقاتی کارڈ اندر بھجوا کر وہ لان پر بیٹھ گیا تھا۔ نوکر نے آکر اس سے اندر چلنے کو کہا۔

"میں یہیں کھلے میں بیٹھنا پسند کروں گا۔" انور نے کہا اور لان چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

نوکر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد سر صغیر پورٹیکو میں دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ لان کی طرف آ رہا تھا۔ چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ انور کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مسٹر انور میں اپنے دوست کے قاتل کی گرفتاری پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"شکریہ۔۔۔!" انور سنجیدگی سے بولا۔ "ذرا اس پر دستخط کر دیجیے۔"

اس نے اپنی جیب سے ایک چیک بک نکال کر سر صغیر کی طرف بڑھادی۔

"پانچ ہزار روپے۔" سر صغیر اسے گھور کر بولا۔ "کیوں اس کا کیا مطلب۔۔۔!"

"یہ اس سیاہ پکھراج سے تعلّق رکھتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" سر صغیر نے آہستہ سے کہا۔ پھر دفعتاً اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ نتھنے پھڑکنے لگے اور وہ گرج کر بولا۔ "تُم مُجھے بلیک میل کرنے آئے ہو۔ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

"بگڑنے کی ضرورت نہیں۔" انور مُسکرا کر بولا۔ "آپ جانتے تھے کہ وہ سیاہ پکھراج چوری کا ہے لیکن پھر بھی آپ نے اسے وجے کمار سے خرید لیا تھا۔"

"جی۔۔۔جی۔۔۔!" سر صغیر ہکلایا۔

"جی ہاں۔۔۔اور یہی نہیں۔۔۔ آپ نے اسی خوف سے اُسے ایک ایسی عورت کو

دے دیا تھا جس سے آپ کے ناجائز تعلّقات ہیں۔"

"تم فضول بکواس کر رہے ہو۔" سر صغیر پھر گرجا۔

"میرا اشارہ گلوریا تمو تھی کی طرف ہے۔" انور نے مُسکرا کر کہا۔ "لیکن آپ نے وہ پتھّر اس کے پاس امانتاً رکھوایا تھا۔"

سر صغیر کُچھ نہ بولا۔ وہ خاموشی سے تھوک نگل رہا تھا۔

"کہئے تو یہ بھی بتادوں کہ وہ پروفیسر تیموری کے پاس کیسے پہنچ گیا تھا۔"

انور نے کہا اور سر صغیر کی طرف شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"تم نہ جانے کیا بک رہے ہو۔"

"گھبرایئے نہیں۔۔۔ میں جو کُچھ بھی بک رہا ہوں وہ میرے اخبار میں نہ چھپے گا۔ اُس پکھراج کی اصلیّت سے صرف میں واقف ہوں۔ میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ ہاں تو اسی دوران میں پروفیسر تیموری نے نکولس کو قرض ادا کر دینے کا

نوٹس دے دیا اور شاید آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ وہ نوٹس بعد میں واپس بھی لے لیا گیا تھا؟ ہوا یہ کہ گلوریا نے آپ کا سیاہ پتھّر نکولس کو دے دیا کہ وہ اسے بطور ضمانت پروفیسر تیموری کے پاس رکھوا دے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور پروفیسر نے نوٹس لے لیا۔ لیکن چونکہ ایک بہت ہی نایاب پتھّر پروفیسر کے ہاتھ لگا تھا اس لیے اس نے ضروری سمجھا کہ وہ اس کی نمائش کر کے اپنے ہم پیشہ اور ہم شوق لوگوں پر رُعب ڈالے۔ اِس سِلسِلے میں اس نے چند لوگوں کو دعوت دی اس میں آپ اور آپ کی صاحبزادی بھی تھیں۔ کھانے کے بعد اس نے پتھّروں کی نمائش کی سیاہ پکھراج اس کے پاس دیکھ کر آپ کو بہت تاؤ آیا۔ واپسی پر آپ نے گلوریا سے باز پرس کی۔ بہر حال آپ اسے دوبارہ واپس لینا چاہتے تھے۔ اس لیے آپ نے پھر وجے کمار کی خدمات حاصل کیں اور وہ اسے پروفیسر کے یہاں سے چُرا لایا۔ دوسرے ہی دِن صُبح وہ پھر آپ کے پاس سے غائب ہو گیا۔ اس بار اسے آپ کی صاحبزادی نے اڑایا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دراصل آپ ہی کی ملکیّت تھا۔ وہ اسے پروفیسر کے یہاں دیکھ ہی چکی تھی۔ اس لیے سمجھیں کہ شاید

آپ اُسے چرا لائے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسے آپ سے چھپا کر واپس کرنے کی ٹھان لی اور اس سلسلے میں انہوں نے خاکسار کی خدمات حاصل کیں۔ میں نے جن حالات میں وہ پتھّر اس کی جگہ پر پہنچایا وہ بہت ہی خطرناک تھے۔"

"میں جانتا ہوں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔" سر صغیر بے صبری سے بولا۔

"اور میں مبلغ پانچ ہزار روپے بطور حق المحنت طلب کر رہا ہوں اور ہاں شاید آپ یہ بھی سننا پسند کریں کہ پروفیسر نکولس کے ہتھوڑے سے کس طرح قتل ہوا۔۔۔؟ خیر سنیے۔۔۔ آپ سمجھے تھے کہ شاید پروفیسر ہی نے اُسے دوبارہ آپ کے پاس سے غائب کرا دیا۔ لہٰذا آپ پھر گلوریا کے پاس پُہنچے اور اسے خوب کھری کھری سنائیں۔ اسی رات کو گلوریا نے سوچا کہ وہ کیوں نہ اس پتھّر کو پروفیسر کے یہاں سے چرا کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو واپس کر دے۔ وہ جانتی تھی کہ پروفیسر اسے تجوری میں رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ نکولس کا ہتھوڑا لے کر وہاں پہنچی۔ اُسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ پروفیسر رات کو باہر ہی رہے گا۔ اس نے پروفیسر کی خواب گاہ کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر داخل ہو گئی۔ لیکن وہ اچھّی طرح سنبھل بھی نہ

پائی تھی کہ اسے مکان کے اندر قدموں کی آہٹ سُنائی دی اور وہ گھبراہٹ میں ہتھوڑاوہیں چھوڑ کر کھڑکی سے کود گئی۔ آنے والا پروفیسر کا قاتل تھا۔ اُسے وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پروفیسر گھر پر موجود نہیں ہے اس لیے اس نے نہایت اطمینان سے اپنی کنجیوں کا لچھّا استعمال کیا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا اس لیے اس نے اقرار نامے کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اس کے کامیاب ہونے سے پہلے ہی پروفیسر آگیا اور قاتل نے اُسی ہتھوڑے سے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ختم کرنے کے بعد بھاگ ہی رہا تھا کہ وجے کمار پہنچ گیا اور پھر شاید اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی جس وجہ سے وہ بھی اُس کے ہاتھ سے مارا گیا اور ہاں اس رات کو بھی آپ ہی نے وجے کمار کو وہاں بھیجا تھا کہ وہ اس پتھّر کو دوبارہ چرالائے۔

ہاں تو جناب جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر کی لاش سے مُڈبھیڑ ہو گئی آپ خود سوچیے کہ وہ چیز کتنی خطرناک تھی اور پھر جبکہ پروفیسر تار جام ہی سے انسپکٹر آصف کو فون کر چکا تھا کہ اس کے مکان کی حفاظت کی جائے۔ اگر میں ذرا سا بھی

چوک جاتا تو وہاں پکڑا گیا تھا۔"

انور خاموش ہو گیا۔

"میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ ان معلومات کو اپنے ہی تک محدود رکھیے گا۔"
سر صغیر نے کہا۔ "رابعہ نے مجھے پہلے ہی اس کے متعلّق بتا دیا تھا اور میں بہت
پریشان تھا۔" سر صغیر نے چیک پر دستخط کر دیئے۔

"شکریہ۔" انور نے چیک بُک تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "مطمئن
رہیے میں بلیک میلر نہیں ہوں۔۔۔ اچھّا۔۔۔ آداب عرض۔۔۔!"

پھاٹک سے نکل کر وہ موٹر سائیکل کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ رابعہ نے اس کا راستہ
روک لیا۔

"تو تم نے سب کُچھ بتا دیا۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"جتنا تُم نے بتایا تھا اس سے آگے نہیں بڑھا۔"

”یعنی کہ۔۔۔!“

”ہاں ہاں۔۔۔ میں نے ان سے یہ نہیں بتایا کہ تم نے وہ رات نشاط نگر میں سیکریٹری کے ساتھ بسر کی تھی۔“

”شکریہ۔۔۔بہت بہت شکریہ۔“

”ٹاٹا۔۔۔!“ انور نے ہاتھ ہلایا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔

ختم شد